**BUDLA-135**

# STUDY OF MODERN URDU PROSE AND POETRY

## جدید اردو نثر اور شاعری کا مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومینٹیز

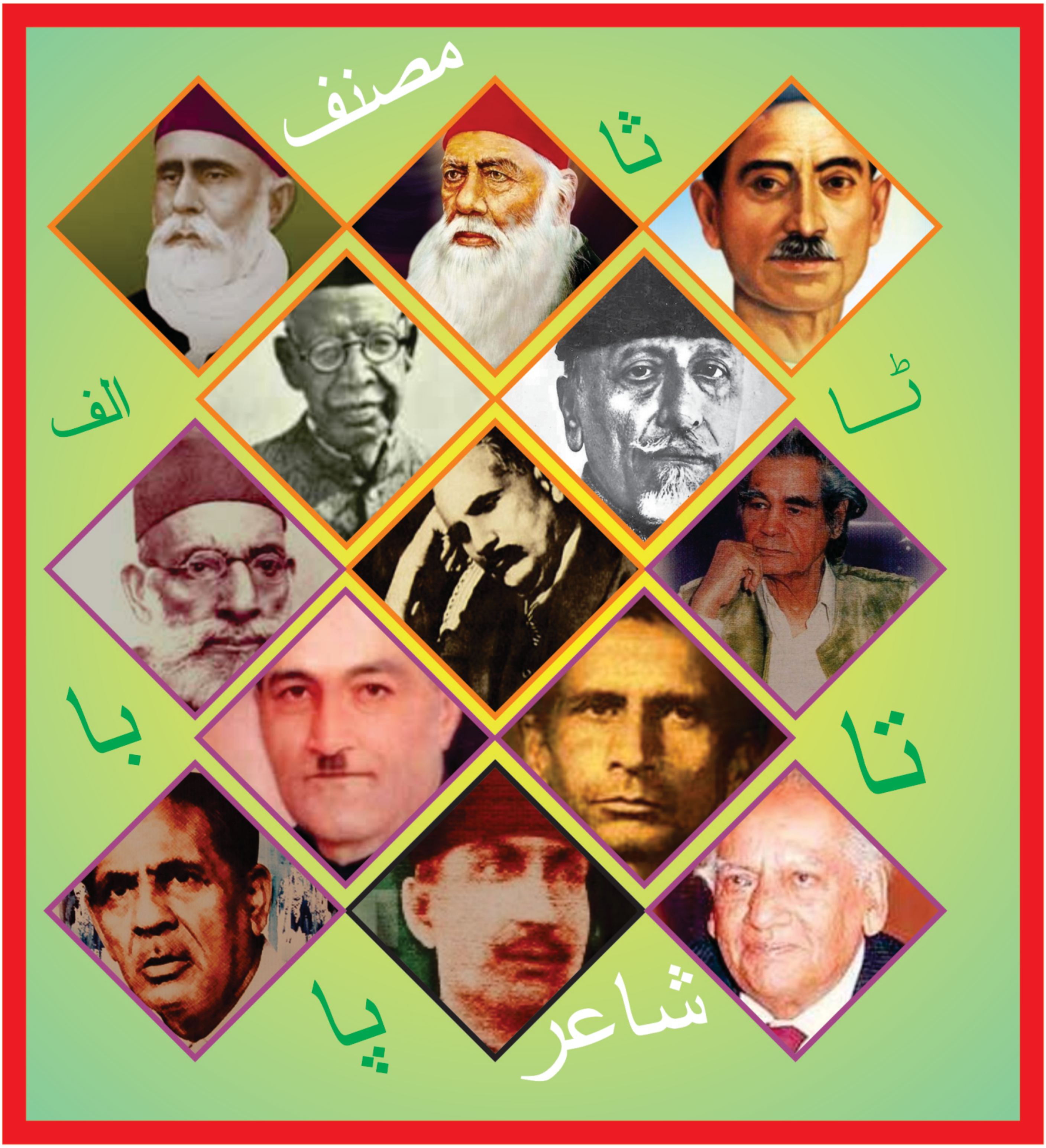


# جدید اردو شاعری

Block: **2**

"تعلیم انسان کو پابندیوں سے آزاد کرتی ھے اور آج کے
عھد میں یه جمھوریت کے احساس کی بنیاد ھے۔ تعلیم
جنم اور حالات سے پیدا ھونے والی ذات برادری اور
دوسری طبقاتی تفریق کو ختم کرکے انسان کو ایسی
تمام برائیوں سے اوپر اٹھاتی ھے۔" **اندرا گاندھی**

"Education is a liberating force, and in our age it is also democratising force, cutting across the barriars of caste and class, smoothi out inequalities imposed by birth and other circumstances." **Indira Gandhi**

**BUDLA-135**

جدید اردو نثر اور شاعری کا مطالعہ

اندرا گاندھی
نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومینٹیز

IGNOU
The People's
University

# بلاک 2 جدید اردو شاعری

کورس کا تعارف

بلاک نمبر 2 کا تعارف


**اکائی 7**

جدید اردو شاعری کا ارتقا 9

**اکائی 8**

حسرت موہانی کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ 21

**اکائی 9**

فانی بدایونی کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ 32

**اکائی 10**

علامہ اقبال کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ 41

**اکائی 11**

فراق گورکھپوری کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ 55

**اکائی 12**

جوش ملیح آبادی کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ 69

**اکائی 13**

فیض احمد فیض کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ 78

**اکائی 14**

اسرار الحق مجاز کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ 91

**اکائی 15**

علی سردار جعفری کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ 103

## Expert Committee

Professor Satyakam, Director, School of Humanities, IGNOU, New Delhi.
Professor Wahajuddin Alvi, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi.
Professor,Tauqeer Ahmad Khan(Retd),Department of Urdu ,University of Delhi.
Professor Shahid Parvez, Regional Director, (Delhi), Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad.
Professor, Mohd Faruq Ansari, DEL, NCERT, New Delhi

## Course Coordinators

Professor Satyakam, Director, School of Humanities, IGNOU, New Delhi
Dr. Abdul Hafiz Consultant Urdu, School of Humanities, IGNOU, New Delhi.
Dr. Mohd Akbar, Ex Consultant, SOH, IGNOU, New Delhi. Presently, Assistant Prof. CPDUMT, MANUU, Hyderabad.

**EDITOR**

Prof. Mohd Shahid Husain (Retired Professor, JNU)

## Course Preparation

| | |
|---|---|
| Professor Naseer Ahmad Khan (Retd),<br>Jawaharlal Nehru University, New Delhi, | Units-1, 2, 3 & 7 |
| Dr. Mohd Asif Zahri, (Assistant Professor)<br>CIL Jawaharlal Nehru University, New Delhi. | Units- 4 & 14 |
| Professor Shahid Parvez, Regional Director, (Delhi),<br>Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, | Unit-5. |
| Professor Saheb Ali,<br>Dept of Urdu, Bombay University, Mumbai | Unit- 6. |
| Professor Qazi Obaid ur Rehman Hashmi,(Retd),<br>Dept of Urdu, Jamia Milia Islamia, New Delhi | Units- 8,11 & 13 |
| Professor, Mohd Faruq Ansari,<br>DEL, NCERT, New Delhi, | Units-9 & 15 |
| Professor,Tauqeer Ahmad Khan (Retd),<br>Department of Urdu, University of Delhi, | Unit-10. |
| Dr. Mohd Akbar,<br>Ex Consultant, SOH, IGNOU, New Delhi.<br>Presently, Assistant Prof. CPDUMT, MANUU, Hyderabad. | Unit- 12 |

## Production

| | | |
|---|---|---|
| Mr. K.N. Mohanan<br>A.R. (P), MPDD | Mr. C.N. Pandey,<br>S.O.(P), MPDD | Mr. Babulal Rewadia<br>S.O.(P), MPDD |

July, 2019
*© Indira Gandhi National Open University, 2019*

ISBN: 978-93-88980-89-0
*All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the copyright holder.*
*Further information on the Indira Gandh National Open University courses may be obtained from the university's office at Maidan Garhi, New Delhi-110068 or the official website of IGNOU at www.ignou.ac.in*
*Printed and published by Registrar, MPDD on behalf of the Indira Gandhi National Open University.*

CRC Prepared by Graphic Printers, Mayur Vihar
**Printed at :** Raj Printers, A-9, Sector B-2, Tronica City, Loni (Gzb.)

# کورس کا تعارف

اس کورس کا مقصد طلبہ کو جدید اردو نثر اور جدید اردو شاعری سے متعلق معلومات فراہم کرانا ہے، تا کہ وہ جدید اردو ادب کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

اس کو پڑھنے والے ایسے بھی ہوں گے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ وہ بچپن سے اسے بولتے اور سنتے آئے ہوں گے۔ کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کی مادری زبان تو اردو نہیں ہے مگر اردو کو دوسری زبان کے طور پر پڑھا اور قبول کیا ہے۔ اس کورس کی تیاری میں ان سب کا خیال رکھا گیا ہے۔ اردو کے نامور شاعروں اور ادیبوں میں کافی تعداد ایسے ادیبوں اور شاعروں کی ہے جن کی مادری زبان اردو نہ تھی مگر انھوں نے اسے اپنی زبان کے طور پر قبول کرلیا تھا۔

ہم نے اس کورس کو 2 بلاکوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس پورے نصاب کا مقصد جدید اردو نثر اور جدید اردو شاعری سے متعلق جانکاری حاصل کرانا ہے۔

پہلا بلاک جدید اردو نثر سے متعلق ہے جس میں کل 6 اکائیاں ہیں۔

پہلی اکائی میں جدید اردو نثر کے عہد بہ عہد ارتقا سے بحث کی گئی ہے اور نثر کی قسموں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نثری اسالیب بیان پر گفتگو کرتے ہوئے نثر نگاروں کے امتیازات زیرِ بحث آئے ہیں۔

دوسری اکائی سرسید احمد خان کی مضمون نگاری اور ''امید کی خوشی'' کے تجزیئے سے متعلق ہے جس میں ان کے مختصر حالاتِ زندگی اور فن پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ''امید کی خوشی'' کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

تیسری اکائی ابوالکلام آزاد کی انشائیہ نگاری اور ''چڑیا چڑے کی کہانی'' سے متعلق ہے، جس میں ابوالکلام آزاد کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کے اسلوب کی خصوصیت اور ان کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھی اکائی میں پریم چند کے حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت پر اظہارِ خیال ہوا ہے۔ موضوع، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے ان کے مشہور افسانے ''شطرنج کے کھلاڑی'' کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

پانچویں اکائی اردو کے مشہور مزاح نگار اور اسکالر رشید احمد صدیقی کے حالاتِ زندگی اور فکر وفن کا جائزہ لیتی ہے۔ یہاں ان کی مشہور تخلیق ''چارپائی'' کو بھی نقل کیا گیا ہے جس کے مطالعے سے ان کے فکر وفن پر روشنی پڑتی ہے۔

چھٹی اکائی الطاف حسین حالی کی سوانح نگاری اور ''یادگارِ غالب'' سے متعلق ہے جس میں حالی کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کے فن سے بحث کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ اس میں ''یادگارِ غالب'' کا تجزیہ بھی شامل کردیا گیا ہے تا کہ ان کے فن کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکے۔

دوسرا بلاک جدید اردو شاعری سے متعلق ہے جس میں 9 اکائیاں ہیں جو 7 سے 15 تک ہیں۔

ساتویں اکائی میں جدید اردو شاعری کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ 1857 کا واقعہ سیاسی اور اقتصادی ہی نہیں تھا بلکہ اس کے دور رس نتائج ہمارے ادب اور تہذیب پر بھی پڑے۔ اردو شاعری کی اصلاح اور اس کی توسیع کا خیال اسی کا ردِ عمل تھا۔ اسی سے شاعری کے تصورات اور اسالیب میں تبدیلی آئی۔ صنائع و بدائع کی سحر آفرینی کا رجحان کمزور پڑا اور عشق و عاشقی کے چرچوں کی گونج مدھم ہوئی۔ یہ اکائی انھیں باتوں کا احاطہ کرتی ہے۔

آٹھویں اکائی حسرت موہانی کی شاعری اور منتخب کلام کے تجزیئے سے متعلق ہے جس میں حسرت موہانی کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کے محاسن اور خصوصیات سے واقفیت کرائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دو غزلوں کی تشریح بھی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی غزلوں کے موضوعات کیا ہیں اور ان کے برتنے کے طریقے کیا ہوتے ہیں۔

نویں اکائی فانی کی شاعری سے متعلق ہے جس میں فانی کی دو غزلوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے، اس کے علاوہ فانی کے حالاتِ زندگی اور فن پر بھی بحث کی گئی ہے۔

دسویں اکائی میں اقبال کی شاعری اور منتخب کلام کے تجزیہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے جس میں اقبال کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے واقفیت کرائی گئی ہے اور ان کے فکر و فن پر بھی بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ پیکر تراشی، سراپا نگاری، نیچرل امیجری اور محاکات نگاری کے بھی بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال فکر و فن دونوں اعتبار سے بے مثال شاعر تھے۔

گیارہویں اکائی فراق کی شاعری اور ان کی دو غزلوں کے تجزیہ پر محیط ہے جس میں فراق کا سوانحی خاکہ اور اس عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے شعری محاسن کو بیان کرتے ہوئے ان کی شاعری کے امتیازات کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ طالب علموں کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو۔

بارہویں اکائی جوش کی شاعری اور منتخب کلام کے تجزیئے سے متعلق ہے جس میں جوش ملیح آبادی کا تعارف اور ان کی نظموں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، ان کے علاوہ ان کی نظم ''بدلی کا چاند'' کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ انیس اشعار پر مشتمل ''بدلی کا چاند'' کی خصوصی یہ ہے کہ جوش نے ایک منظر کو مختلف تشبیہوں اور کیفیتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں جو روانی اور پرکاری ہے وہ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ اکائی انھیں ساری باتوں کا احاطہ کرتی ہے۔

تیرہویں اکائی فیض احمد فیض سے متعلق ہے جس میں فیض احمد فیض کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ سیاسی اور ادبی پس منظر بیان کرتے ہوئے ان کی شاعری کے محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فیض احمد فیض کی شاعری کا ایک اہم موضوع وطن سے محبت بھی ہے۔ انھیں اپنی مٹی سے

بے پناہ پیار تھا۔ یہ مٹی انھیں تصورِ جاناں کی طرح عزیز تھی۔ بسااوقات ان کی شاعری میں محبوبہ اور وطن میں فرق کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

چودھویں اکائی اسرارالحق مجاز کی شاعری سے متعلق ہے جس میں ان کی مشہور نظم ''آوارہ'' کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ یہ اکائی مجاز کی شخصیت اور شاعری سے متعارف بھی کراتی ہے، جنھیں ان کی رومانی اور باغیانہ فکر کے سبب انگریزی شاعر کیٹس سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مجاز اپنی 45 سالہ زندگی میں کیسے کیسے حالات و حوادث سے گزرتے رہے اور بحیثیت شاعر ان کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟

اس بلاک کی پندرھویں یعنی آخری اکائی علی سردار جعفری کی شاعری اور منتخب کلام کے تجزیے کے سلسلے میں ہے۔ اس اکائی میں ان کی شاعری کی قدر و قیمت اور اس کے محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

# بلاک 2 کا تعارف

دوسرا بلاک جدید اردو شاعری سے متعلق ہے جس میں 9 اکائیاں ہیں جو 7 سے 15 تک ہیں۔

ساتویں اکائی میں جدید اردو شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ 1857 کا واقعہ ایک سیاسی اور اقتصادی ہی نہیں تھا بلکہ اس کے دوررس نتائج ہمارے ادب اور تہذیب پر بھی پڑے۔ اردو شاعری کی اصلاح اور اس کی توسیع کا خیال اسی کا ردِعمل تھا۔ اسی کے اثر سے شاعری کے تصورات اور اسالیب میں تبدیلی آئی۔ صنائع و بدائع کی سحر آفرینی کا رجحان کمزور پڑا اور عشق و عاشقی کے چرچوں کی گونج مدھم ہوئی۔ یہ اکائی انھیں باتوں کا احاطہ کرتی ہے۔

آٹھویں اکائی حسرت موہانی کی شاعری اور منتخب کلام کے تجزیے سے متعلق ہے جس میں حسرت موہانی کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کے محاسن اور خصوصیات سے واقفیت کرائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دو غزلوں کی تشریح بھی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی غزلوں کے موضوعات کیا ہیں اور ان کے برتنے کے طریقے کیا ہوتے ہیں۔

نویں اکائی فانی کی شاعری سے متعلق ہے جس میں فانی کی دو غزلوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے، اس کے علاوہ فانی کے حالاتِ زندگی اور فن پر بھی بحث کی گئی ہے۔

دسویں اکائی میں اقبال کی شاعری اور منتخب کلام کے تجزیہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے جس میں اقبال کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے واقفیت کرائی گئی ہے اور ان کے فکر وفن پر بھی بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ پیکر تراشی، سراپا نگاری، نیچرل امیجری اور محاکات نگاری کے بھی بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال فکر وفن دونوں اعتبار سے بے مثال شاعر تھے۔

گیارہویں اکائی فراق کی شاعری اور ان کی دو غزلوں کے تجزیہ پر محیط ہے جس میں فراق کا سوانحی خاکہ اور اس عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے شعری محاسن کو بیان کرتے ہوئے ان کی شاعری کے امتیازات کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ طالب علموں کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو۔

بارہویں اکائی جوش کی شاعری اور منتخب کلام کے تجزیے سے متعلق ہے جس میں جوش ملیح آبادی کا تعارف اور ان کی نظموں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، ان کے علاوہ ان کی نظم ''بدلی کا چاند'' کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ انیس اشعار پر مشتمل ''بدلی کا چاند'' کی خصوصیت یہ ہے کہ جوش نے ایک منظر کو مختلف تشبیہوں اور کیفیتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں جو روانی اور پرکاری ہے وہ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ اکائی انھیں ساری باتوں کا احاطہ کرتی ہے۔

تیرہویں اکائی فیض احمد فیض سے متعلق ہے جس میں فیض احمد فیض کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ سیاسی اور ادبی پس منظر بیان کرتے ہوئے ان کی شاعری کے محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فیض احمد فیض کی شاعری کا ایک اہم موضوع وطن سے محبت بھی ہے۔ انھیں اپنی مٹی سے بے پناہ پیار تھا۔ یہ مٹی انھیں تصورِ جاناں کی طرح عزیز تھی۔ بسا اوقات ان کی شاعری میں محبوبہ اور وطن میں فرق کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

چودھویں اکائی اسرارالحق مجاز کی شاعری سے متعلق ہے جس میں ان کی مشہور نظم ''آوارہ'' کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ یہ اکائی مجاز کی شخصیت اور شاعری سے متعارف بھی کراتی ہے، جنھیں ان کی رومانی اور باغیانہ فکر کے سبب انگریزی شاعر کیٹس سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مجاز اپنی 45 سالہ زندگی میں کیسے کیسے حالات وحوادث سے گزرتے رہے اور بحیثیت شاعر ان کا مقام ومرتبہ کیا ہے؟

اس بلاک کی پندرھویں یعنی آخری اکائی علی سردار جعفری کی شاعری اور منتخب کلام کے تجزیے کے سلسلے میں ہے۔ اس اکائی میں ان کی شاعری کی قدر و قیمت اور اس کے محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

# اکائی نمبر 7 جدید اردو شاعری کا ارتقا

## ساخت


7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 جدید اردو شاعری کا ارتقا

7.4 آپ نے کیا سیکھا

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

7.6 سوالوں کے جوابات

7.7 کتب برائے مطالعہ


## 7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- جدید اردو شاعری کے رجحانات ومیلانات کا پتہ لگائیں گے۔
- جدید عہد کے شاعروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- جدید شاعری کی اصناف اور موضوعات کا جائزہ لیں گے۔
- جدید اردو شاعری کی قدر وقیمت متعین کریں گے۔

## 7.2 تمہید

جدید اردو ادب کا خیال آتے ہی سر سید احمد خاں، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، نزیر احمد، شبلی نعمانی وغیرہ کے نام روشن حروف میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ان تمام ادیبوں اور شاعروں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور ہوا کے رُخ کو پہچان کر اردو ادب کی باگ ڈور موڑ دی۔جدید رنگ کا مطلب یہ نہیں کہ پرانے رنگ کا ادب ختم ہوگیا۔سینکڑوں شاعر اور ادیب اب بھی چھوٹے چھوٹے درباروں سے وابستہ تھے اور پرانی روایتوں کی نقل کر رہے تھے۔ان میں اسیر لکھنوی، امیر مینائی، داغ دہلوی اور جلال لکھنوی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ قدیم رنگ کے بہت بڑے شاعر تھے۔امیر مینائی کے کئی دیوان شائع ہوئے۔داغ کے کئی دیوان منظرِ عام پر آئے۔اسیر کے کئی دیوان چھپے۔جلال نے دیوانوں کے علاوہ زبان کے اصولوں پر کتابیں لکھیں۔ ان حضرات کے شاگردوں میں ریاض، خلیل، نوح، بے خود وغیرہ مشہور ہوئے۔

خواجہ الطاف حسین حالی کو جدید اردو ادب کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔غدر کے بعد زمانہ بدل رہا تھا۔انھوں نے مسدس حالی لکھی اور محمد حسین آزاد کے کہنے پر نئے ڈھنگ کی نظمیں کہیں۔اکبر الہ آبادی کی شاعری میں

جدید اور قدیم، مشرق اور مغرب کی کشمکش تھی۔ انھوں نے ہنسی ہنسی میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ محمد حسین آزاد اور حالی نے غزل کی دنیا سے نکل کر نظموں کی طرف توجہ دی۔ اس طرح مبالغہ آرائی، قافیہ پیمائی اور رسمی خیالات کم ہو گئے اور سچائی کے ساتھ دل کی باتیں کہی جانے لگیں۔ غزل رسمی چیز بن کر رہ گئی تھی لیکن شاد، حسرت، صفی، سیماب، اصغر، فانی، جگر، اثر، یگانہ وغیرہ نے اس میں نئی روح پھونکی۔ انھوں نے غزل کی رنگینی کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں اعلیٰ خیالات، سچی دلی کیفیات اور زندگی کی حقیقتوں کو لے کر خاکے پیش کیے۔ نظم لکھنے کا جو سلسلہ آزاد، حالی، شبلی اور اکبر نے شروع کیا تھا اس نے ایک غیر معمولی شاعر محمد اقبال کو جنم دیا۔ انھوں نے فلسفہ اور شاعری، رنگینی اور سنجیدگی کو اس طرح ملایا کہ اردو شاعری کا معیار کافی بلند ہوگیا۔ اقبال نے انسان کی عظمت، آزادی اور قوت کے گیت گائے۔ درگاہ سہائے سرور جہان آبادی نے جدید اردو شاعری میں اپنی منظر نگاری اور جذبات نگاری سے اضافہ کیا۔ حالی اور آزاد کے عہد سے لے کر آج تک جنھوں نے ادب تخلیق کیا وہ لوگ مغرب سے متاثر ضرور تھے لیکن انھوں نے مغربی طرز فکر، اندازِ نظر اور خیالات کو قبول نہیں کیا بلکہ ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

## 7.3 جدید اردو شاعری کا ارتقا

1857 کا واقعہ ایک سیاسی اور اقتصادی ہی نہیں تھا بلکہ اس کے دور رس نتائج ہمارے ادب اور تہذیب پر بھی پڑے۔ اردو شاعری کی اصلاح اور اس کی توسیع کا خیال اسی کا ردّ عمل تھا۔ محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی نے نئی طرز کی شاعری کا بیڑا اٹھایا جسکی ابتدا نظیر اکبر آبادی اپنی نظموں کے ذریعے کر چکے تھے۔ جدید شاعری کی خصوصیات اور خدو خال قدیم اور کلاسیکی شاعری سے مختلف تھے۔ شاعری کے تصورات اور اسالیب میں تبدیلی آچکی تھی۔ اب اردو شاعری میں عشق و عاشقی کے چرچوں کی گونج کم اور حسن کاری اور صنائع بدائع کی سحر آفرینی کا رجحان کمزور پڑ گیا تھا۔ یہ میلان اس لیے معدوم ہونے لگا کہ نئے شعرا اپنے اپنے خیالات سے عوام میں ذہنی بیداری کے خواہاں تھے اور سادہ و روزمرہ کی زبان میں مفاہیم ادا کر کے انھیں اس کی اہمیت کا قائل کروانا چاہتے تھے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد سے قومیت اور وطنیت کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا۔ مذہبی سرمائے کی فصاحت اور ثقافتی اثاثے کی حرمت کے احساس نے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ اخلاقی نظمیں لکھی گئیں اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے وابستہ ہونے کی طرف لوگ متوجہ ہوئے۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ اردو شاعری ایرانی اثرات سے دور، اپنے وطن اور گرد و پیش کے مسائل سے قریب ہوگئی۔ اردو شاعری کی ہیئت اور معنی دونوں متاثر ہوئے۔ شرر، نظم طبا طبائی اور اسماعیل میرٹھی وغیرہ نے بے قافیہ اور مغربی طرز کی نظمیں لکھی۔ آزاد اور حالی نے ادب کی بعض قدیم ہیئتوں میں جدید شاعری کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ حالی نے مسدس کی ادبی ہیئت میں ''مدو جزر اسلام'' پیش کیا اور قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ مسدس میں افادیت اور مقصدیت تھی اور عصری حسیّت بھی۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے جلسے میں اگست 1867 کو قدیم شاعری کی بعض کوتاہیوں کا تذکرہ کیا اور جدید شاعری سے روشناس کرایا۔ انھوں نے جدید طرز کے مشاعرے بھی منعقد کرائے جس میں مصرعہ طرح کی جگہ نظم کا عنوان دیا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت اصلاحی مہم سے کم نہ تھی۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھا اس میں بھی انھوں نے اُن خامیوں کی طرف اشارہ کیا جو قدیم شاعری میں پیدا ہوگئی

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

یادداشتیں

تھیں۔ جدید شاعری کو پروان چڑھانے میں سرسید احمد خاں کا بھی بڑا دخل تھا۔ان ہی کے کہنے پر مسدس لکھی گئی تھی۔اسماعیل میرٹھی جدید رنگ کے نقش اول ہیں۔انھوں نے جدید شاعری میں شعریت کا عنصر ڈال کر اُسے دلنشیں اورخوبصورت بنا دیا۔

محمد حسین آزاد کے ذہن میں اردو شاعری کی اصلاح کا خیال 1867 میں آیا جیسا کہ ''نظم آزاد'' سے ظاہر ہوتا ہے۔جلد ہی اس خیال نے ایک رجحان کی شکل اختیار کرلی۔انھوں نے روایتی شاعری کے کمزور پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے نیچرل شاعری کی وضاحت کی، وہ تشبیہات و استعارات، آرائش وسجاوٹ کی مصنوعی چمک دمک کے خلاف تھے۔ یہ انجمن پنجاب کے نئے ادبی میلانات کا خلاصہ تھا۔آزاد نے غزل کے مقابلے میں نظم کو ترجیح دی۔ حب وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت، وہم اور اخلاق آزاد کی یادگار نظمیں ہیں۔آزاد نے اپنی نظموں میں فطرت کے عمل کو تخیل سے ابھارنے اور ان کی صورت گری کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اردو شاعری میں ردیف وقوافی کی پابندیوں کو محسوس کرتے ہوئے انھیں تخیل اور فطری بیان میں رکاوٹ کہا ہے۔نظم نگاری کے لیے مثنوی کی ہیت کو منتخب کیا۔

درگا سہائے سرور جہاں آبادی اردو کے ان چند شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے شاعری میں ہندستانی طرز فکر، ماحول،رسم و عقائد اور اساطیر کی سچی ترجمانی کی ہے۔سرور ایک معزز کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔1873 میں پیدا ہوئے اور 1910 میں رحلت کی ۔وہ انگریزی، فارسی،اردو اور سنسکرت جانتے تھے۔انھوں نے انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔وہ کئی اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر بھی رہے۔وہ شاعری میں کرامت حسین بہار سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ان کی ادبی کاوشوں میں ''خون ناحق''، نیرنگ قلق، نشتر ماتم، نالہ خونچکاں اور مثنوی'' شوز فغاں'' کے نام شامل ہیں۔ایک منظوم ڈرامے کے علاوہ ''محشر'' اور''وصال'' کے نام سے دو ناول بھی لکھے۔ان کے مجموعہ کلام'' جام سرور'' اور جم خانہ سرور کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔سرور کی شناخت ان کی نظم نگاری سے ہوتی ہے۔فطری مناظر سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ مناظر قدرت پر ان کی کئی نظمیں ہیں۔ اردو میں تاریخی اور اساطیری نغموں کا آغاز بھی انھوں نے ہی کیا تھا۔سرور کی حب الوطنی اور انسان دوستی کا اندازہ ان کی نظموں سے لگایا جاسکتا ہے۔انھوں نے بعض ادبی شخصیتوں کی وفات پر مرثیے بھی لکھے۔

الطاف حسین حالی نے اپنی ابتدائی شاعری میں روایتی انداز کو اختیار کیا اورعشقیہ شاعری کے تمام لوازم کی پاسداری کی لیکن بدلے ہوئے حالات،شعور کی بالیدگی،عصری حسیت اور سرسید کی رفاقت نے ان میں نئی زندگی کے حقائق کو منکشف کردیا اور وہ نظم نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔سرسید کی فرمائش پر انھوں نے مسدس لکھی جس میں مسلمانوں کے اخلاقی تنزل، معاشی بدحالی اور ذہنی پستی کی تصویریں پیش کی گئی ہیں ۔ یہ قوم کا مرثیہ بھی ہے اور بدلے ہوئے حالات میں جینے کا سلیقہ سیکھنے اور ہمیں نیا شعور اپنانے کی دعوت بھی۔حالی انجمن پنجاب میں منعقد ہونے والے مشاعروں سے بہت متاثر ہوئے۔انھوں نے ''برکھارت'' نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم وانصاف پیش کیں جو بہت سراہی گئیں۔ حالی نے اپنی نظموں کے ذریعے دردمندی، سادگی،خلوص اور بیساختگی کی اہمیت واضح کی ۔مناجات بیوہ اور چپ کی داد میں حالی نسواں طبقے کے غمگسار اور ہمدرد کی حیثیت سے ہمارے

سامنے آتے ہیں۔ حالی نے اپنی نظموں کے لیے چھوٹی بحروں کا استعمال کیا ہے۔ ان کی نظمیں فکر انگیز بھی ہیں اور سبق آمیز بھی۔ طرز ادا سادہ، فطری، موثر اور بے ساختہ ہے۔ مناجاتِ بیوہ میں عورت کے مختلف روپ بتاتے ہوئے اُسے محبوبہ کے علاوہ ایک ماں، ایک بہن اور ایک بیٹی بھی بتایا ہے۔ حالی اردو کے ان اولین نظم نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے مقامی رنگ کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ مناجاتِ بیوہ، بارہ ماسہ کی طرز میں لکھی گئی ہے۔ ''مسدس حالی یا مدو جزر اسلام'' حالی کا شاہکار ہے۔ اس اصلاحی نظم کو تاریخی حیثیت اور تہذیبی شعور کی دستاویز کہا جا سکتا ہے۔ اس نظم اور اسکے مقدمے نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا۔ حالی کی نظمیں عصری حیثیت اور رچے ہوئے تہذیبی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ الطاف حسین حالی 1837 کو پانی پت میں پیدا ہوئے اور 1914 کو رحلت فرمائی۔ وہ غالب کے چہیتے شاگردوں میں تھے اور سرسید احمد خاں کے ''عناصر خمسہ'' کا حصہ تھے

اسماعیل میرٹھی 1844 کو پیدا ہوئے اور 78 سال کی عمر میں 1917 میں وفات پائی۔ آبائی وطن میرٹھ تھا۔ ان کے جد امجد بابر کے ساتھ ہندستان میں وارد ہوئے۔ انھوں نے اردو نظم کو نئی شناخت دی۔ اردو کو ترجموں سے مالا مال کیا۔ بچوں کے لیے ادب لکھا۔ انھوں نے دلنشیں غزلیں بھی کہی ہیں۔ انھیں قصائد، قطعات اور رباعی وغیرہ سے بھی سروکار تھا۔ انھیں فارسی پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ ریاضی، طبعی علوم اور علم ہیت سے ذہنی لگاؤ تھا۔ رڑکی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ 1860 میں میرٹھ سرکل کے لیے انسپکٹر آف اسکول مقرر ہوئے۔ 1888 میں فارسی استاد کی حیثیت سے سنٹرل فارمل اسکول آگرہ میں تقرر ہو گیا اور یہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ رسالہ معارف میں ان کی مشہور نظمیں ''شمع ہستی'' اور سیف وقلم کے نام سے شائع ہوئیں۔ ''صبح کی آمد'' نجم الاخبار میں چھپی۔ ان کی غزلوں میں دو رجحانات نظر آتے ہیں: وارداتِ عشق کی عکاسی اور مصوفانہ اندازِ فکر۔ غزلوں کی زبان صاف اور ستھری ہے۔ ان میں نیا رچاؤ ہے اور تجربات عشق کی اچھی عکاسی ہے۔ انھوں نے قصیدے بھی لکھے ہیں جن میں مقصدی اور اصلاحی پہلو نمایاں ہیں: خدائی لشکر، جاڑا اور گرمی، اختلاف رائے، عالم شہود وغیرہ نمائندہ قصیدے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی انھوں نے لکھی ہیں جن میں نیچرل شاعری کا اثر اور جدید لب ولہجہ نمایاں ہے۔ ان کی نظموں میں مناظرِ قدرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے ادب کو اپنی شگفتہ، سادہ رواں اور دلچسپ تخلیقات سے مالا مال کیا ہے۔ بچوں کے لیے جو درسی کتابیں لکھی ہیں ان میں اردو زبان کا قاعدہ، اردو کی پہلی، دوسری تیسری چوتھی اور پانچویں کتابیں شامل ہیں جن میں بچوں کے مزاج، ان کی دلچسپیوں اور معیار کو پیش نظر رکھا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اسلم کی بلی، پن چکی، سچ کہو، ایک جگنو اور بچے کی باتیں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اکبر الہ آبادی 1846 میں بادہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے اور 1921 کو دارِ فانی سے کوچ کیا۔ اکبر الہ آبادی یوپی کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مورثِ اعلیٰ 1021 میں نیشا پور (ایران) سے ہندستان آئے تھے۔ ان کے والد بنگال کے صوبے دار تھے اور جنگ پلاسی میں انگریزی فوج میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی، اردو ریاضی اور انگیزی کی تعلیم حاصل کی۔ فلسفہ اور مذہب بھی ان کی دلچسپی کا موضوع بن گئے۔ فیوچر آف اسلام کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ 1866 میں مختاری کا امتحان پاس کرکے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور بعد میں عدالت خفیفہ کی ججی کے عہدہ پر مامور ہو کر 1903 میں پینشن لے کر ادب کی

یادداشتیں

خدمت میں اپنا وقت گزارا۔ سنجیدہ شاعری میں اکبر کا رنگ اور طرز منفرد ہے۔ انھوں نے غزل میں اس کی روایت کی پابندی کی۔ سرسید کی انگریزی درسی مصلحت پسندی اور ان کے تہذیبی مسلک سے ذہنی ہم آہنگی نہیں رکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے نظم جدید کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ نظموں میں ان کا طرزِ فکر اور پیرائیہ بیان دونوں الگ ہیں۔ تعلیم نِسواں، نظم قوانی، جلوہ دربارِ دہلی، گرمی بحث میں، انور نے اکبر سے کہا، دریا کی روانی کے موضوعات فکر انگیز اور سنجیدہ ہیں۔ ''برق یکسا'' میں مسلمانوں کو زبوں حالی، افلاس اور مذہب سے لاپرواہی و بے نیازی کو بڑے پُر درد انداز میں بیان کیا ہے۔ شاعری میں جدّت اور موضوعات میں وسعت اور عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل آنے کے تعلق سے وہ آزاد اور حالی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کو ملک وقوم کی اصلاح کا ذریعہ سمجھا ہے۔ اخلاق، معاشرت کی بہبود بھی اس کا مقصد ہے اور اس میں سیاسی رجحانات و واقعات کو بھی جگہ ملنا چاہیے۔ انھوں نے طنز ومزاح کے پیرائے میں بہت سی ایسی اصلاحی باتیں کہہ دی ہیں جو بڑی بڑی سنجیدہ کتابوں میں بھی بیان نہیں کی جاسکتیں۔ مشرقیت سے بے پناہ محبت، روایات کے احترام اور اپنے مذہبی اثاثے کے لٹ جانے کے اندیشے نے اکبر کو محتاط اور مغرب سے گریزاں بنا دیا تھا۔ اس لیے وہ مغرب کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور لوگوں کو اس سے دور رکھنے کے لیے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اکبر الفاظ کے مفہوم ہی نہیں ان سے قاری کے ذہن میں تخلیق ہونے والی فضا کا بھی شعور رکھتے تھے۔ رعایت لفظی اکبر کی شاعری میں اکثر جگہ ظریفانہ تاثر میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ ابتدائی دور ہی سے ضلع جگت اور لفظی مناسبت کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں، غزلوں، قطعات اور رباعیوں میں روزمرہ کی بامحاورہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ وہ مزاحیہ شاعری کے ابلاغی امکانات سے خوب واقف تھے۔ بعض ناقدین نے اکبر کو تضمین کا بادشاہ کہا ہے۔ ان کے کلام میں تحقیر کی بھی اچھی مثالیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

برج نارائن چکبست 1882 میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور 1926 کو رحلت فرمائی۔ ان کا تعلق کشمیر پنڈتوں کے خاندان سے تھا۔ ان کے والد پٹنہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ روایتی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد اسکول سے مڈل امتحان پاس کیا۔ 1900 میں میٹرک اور 1905 میں بی۔ اے کرنے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کیا اور وکالت شروع کردی والد کے انتقال کے بعد تربیت لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ چکبست ایک قوم پرست اور وطن پرست شاعر تھے اور اپنے ہم وطنوں کی بہبودی اور تہذیبی اصلاح کے متمنی تھے۔ چکبست ایک اچھے نثر نگار تھے۔ ڈرامے اور خاکے بھی لکھے۔ انھیں مرثیہ نگاری کا بھی خاصہ سلیقہ تھا۔ ان کی ذہنی تربیت میں بشن نرائن در، تلک اور گوکھلے کے علاوہ مسز اینی بیسنٹ کی ہوم رول تحریک کا کافی دخل ہے وہ اس تحریک کے زبردست حامی بھی تھے۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی میں بہت سے اصلاحی کام انجام دیے؛ مثلاً کشمیری ینگ مین ایسوسی ایشن اور اور بہار لائبریری کا مقام وغیرہ۔ چکبست کی بعض نظموں سے ان کے اصلاحی تصورات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے مثلاً مرقع عبرت اور آب انگور جو اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی ان کی دانست میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ اردو کے ان چند شعرا میں ہیں جن کے کلام نے عوام کے سیاسی شعور کو مہمیز کیا۔ بیداری پیدا کی اور گرد و پیش کا احساس دلایا۔ چکبست کے اکثر مسدس انیسؔ کی اثر پزیری کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے مسدس زورِ بیان، بندشوں کی چستی، لفظوں کی دروبست اور سلاست و روانی کا انداز اور جذبات کی مصوری، بیان پر قدرت، فکری تہداری اور تخیل کی شادابی کے غماز ہیں۔ انھوں نے

گرے کی نظم کا ترجمہ ''گورِ غریباں'' کے نام سے کیا ہے۔نظم کی ہیئت میں بھی طباطبائی نے تجربے کیے ہیں۔عبرت حسرت، قومی نظم، گلاب کا پھول، بے ثباتی دنیا، آہ سرد، پند سودمند، آفتاب سے خطاب ان کی روایتی انداز میں لکھی گئی نظمیں ہیں۔ان کی غزلوں کے دو رنگ نمایاں ہیں۔انھوں نے اپنی بعض نظموں میں اساتذۂ لکھنؤ کی پیروی کی لیکن لفظ پرستی اور نری خارجیت سے گریز کیا ہے۔رعایت لفظی سے بھی کام لیا ہے۔وہ دہلی اسکول سے بھی اثر قبول کرتے ہیں۔نظام کالج جو پہلے مدراس یونی ورسٹی میں تھا کے بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن بھی رہے۔ان کی سفارش پر ہی دیوانِ غالب نصاب میں شامل کیا گیا۔اُسی زمانے میں انھوں نے دیوانِ غالب کی شرح بھی لکھی۔انھوں نے غالب کی بعض عروضی کوتاہیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔شرح امرؤ القیس، مراثی انیس اور عمر خیام بھی ان کی گرانقدر ادبی کاوشیں ہیں۔نثر میں طباطبائی کے مضامین ان کے مخصوص طرز تحریر کے ترجمان ہیں۔

سر محمد اقبال اردو کے چند عہد آفریں تخلیق کاروں میں ہیں۔انھوں نے اردو شاعری کو نئی فکری جہتوں اور معنوی وسعتوں سے آشنا کرایا اور اُسے نیا مزاج و نئی شعری افق عطا کی۔ان کی ولادت 1877 میں سیال کوٹ میں ہوئی اور 1938 میں انتقال فرمایا۔1899 میں فلسفہ میں ایم۔اے اور 1907 میں میونخ یونی ورسٹی جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی کیا انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری بھی حاصل کی۔فارسی کلام کے علاوہ اقبال نے بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضرب کلیم جیسے گرانقدر شعری کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ان کی ابتدائی شاعری میں مناظرِ قدرت و جذبات کی عکاسی اور سوز وطن سے معمور نظمیں ملتی ہیں۔بالِ جبریل اور ضربِ کلیم تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے فکر واحساس اور تہذیبی و سیاسی حسیت کی بہت سی منزلیں طے کر لی تھیں۔وہ فکر انسانی اور زندگی کو ارتقا پزیر اور حرکی سمجھتے ہیں۔اقبال کے کلام میں خودی کا تصور عینیت اور ہیگل کے نظریہ جدلیت کا وہ خوشگوار امتزاج معلوم ہوتا ہے جسے انھوں نے اسلامی فلسفے اور روایت سے تقویت پہنچا کر ایک نئی معنویت عطا کی۔اقبال کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا غلط ہے کہ وہ اپنے آخری دور میں صرف عالم اسلام کے شاعر ہو کر رہ گئے تھے۔ہمالیہ، تصویر درد، ترانہ ہندی اور نیا شوالہ ان کی وطن پرستی کے جذبے سے سرشار نظمیں ہیں۔آفتاب ان کے ہندستانی تصورات، سالہا سال کی تہذیبی روایات اور ہندستانی فلسفے کی وسعتوں سے آگہی کی دلیل ہے۔نظم کے علاوہ انھوں نے غزل میں بھی اعلیٰ شاعری کی ہے۔نظموں میں ہیت کے تجربے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تلوک چند محروم 1887 کو ضلع گوجراں والاں میں پیدا ہوئے اور 1966 کو انتقال کیا۔وہ حالی، آزاد اور اسماعیل میرٹھی کے بعد اردو نظم کے نئے رجحانات کی پزیرائی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے غزلیں اور رباعیاں بھی کہیں اور بچوں کے ادب میں بھی دلچسپی لی لیکن نظم گوئی کی وجہ سے شناخت قائم ہے۔انھوں نے تدریسی کے فرائض بھی انجام دیئے۔تحریک آزادی سے وابستگی کا ثبوت ان کی نظموں سے ملتا ہے۔لاہور سے راولپنڈی تبادلہ کر کے یہاں چھاونی بورڈ اسکول میں ماسٹر ہو گئے۔تقسیم ہند کے بعد جالندھر ہوتے ہوئے اپنے فرزند جگن ناتھ آزاد کے پاس دہلی آگئے۔اخبار تیج سے وابستہ رہے۔کچھ دن دہلی میں لیکچرار بھی رہے۔گنج معانی، رباعیات محروم، کاروانِ وطن، بہار طفلی، شعلہ نوا۔نیرنگ معانی اور بچوں کی دنیا محروم کی ادبی یادگاریں ہیں۔محروم کی خاصی تعداد میں ایسی نظمیں ہیں جو فطرت کے دلفریب جلووں اور اس کے حسین و رنگین مناظر کی عکاسی کرتی ہیں۔ان کا اسلوب بڑا

یادداشتیں

پر زور اور اثر انگیز ہے۔ درد مندی اور خستگی ان کے کلام میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں برطانوی سامراج کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے رہے۔ رباعیات محروم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فراق، جوش اور انیس کی طرح ان میں بھی رباعی گوئی کی اچھی صلاحتیں موجود تھیں۔ محروم کی ابتدائی غزلوں میں داغ کا رنگ سخن جھلکتا ہے۔ انھوں نے رعایت لفظی سے بھی اپنی غزلوں کو آراستہ کیا ہے۔ غزلوں کے اعتبار سے محروم جدید اور قدیم کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ محروم کی شاعری میں بڑی ہمہ رنگی اور موضوعات کے اعتبار سے بوقلمونی ہے۔

نواب مرزا خاں داغ دہلوی 1831 کو محلّہ چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے اور 1905 میں حیدرآباد میں وفات پائی۔ والد کا سایہ بچپن میں اٹھ جانے کے بعد ان کی والدہ نے صاحبِ عالم مرزا محمد سلطان بہادر کے محل شاہی میں پناہ لی۔ 1857 میں دہلی سے رامپور پہنچے وہاں کے حالات سازگار نہ ہونے پر انھوں نے امرت سر، اجمیر، آگرہ، علی گڑھ، متھرا اور جے پور کا سفر کیا اور پھر وہاں سے 1888 میں حیدرآباد پہنچے۔ جہاں انھوں نے آسودہ زندگی بسر کی۔ مختلف خطابات سے بھی نوازے گئے۔ ان کے دیوان ''گلزارِ داغ'' اور ''ماہتابِ داغ'' ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ انھوں نے مثنوی ''فریاد داغ'' قصائد اور رباعیات بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ داغ کی شاعری غنائیہ اور نشاطیہ شاعری ہے اور ان کے تغزل کی اہم خصوصیات اور مقبولیت کا راز ہے۔ وہ ذہنی طور پر جرأت اور مومن کے قریب ہیں۔ ان کی پرورش قلعہ معلیٰ میں ہوئی تھی جہاں عیش و نشاط اور راگ و رنگ کی محفلیں سجی تھیں۔ باہر بھی حسن و نغمے برس رہے تھے۔ داغ کے عنوان شباب کی نفسیات اسی ماحول کی رہینِ منّت تھی اور یہی فضا ان کی غزلوں کا موضوع اور شخصیت کا جزو بن گئی۔ اس ماحول نے داغ کے تغزل کو مختلف زاویوں سے متاثر کیا ہے۔ داغ کی عیش پسندی اور حسن پرستی نے اخلاقی قدروں کو ٹھیس پہنچائی ہو لیکن اس سے ان کی عشقیہ اور لمسی شاعری نے آب و رنگ بہر حال حاصل کیا ہے۔ ان کا تغزل منفرد بھی ہے اور شگفتہ بھی۔ مخصوص لب و لہجہ، محاوروں کا برجستہ استعمال، الفاظ کے نفیس در و بست ان کی غزلوں کو پر کیف و پر اثر بناتے ہیں۔ ذوق کی رہنمائی میں انھوں نے الفاظ کو پرکھنے کا ہنر سیکھا۔ قلعہ معلہ کی ٹکسالی زبان نے داغ کو خوبصورت پیکروں کی تخلیق پر اکسایا تھا۔ داغ کے اسلوب نے غزل کی زبان کو سادگی سلاست عطا کی اور اسے عام فہم اور شیریں بنایا۔ داغ کی شاعری ایک طرح سے زبان اور محاورے کی شاعری ہے۔ زبان کے چٹخارے اور محاوروں کی موزونیت کے ساتھ برتنے کا انداز داغ کی غزلوں کو چمکاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں حسن ہر جگہ مجازی ہے حقیقی نہیں ہے۔ داغ کے کلام میں ایک انبساطی کیفیت اور رجائیت جاری و ساری نظر آتی ہے اور یہی داغ کے تغزل کی شناخت ہے۔

ریاض خیرآبادی اس اعتبار سے اردو کے منفرد شاعر ہیں کہ انھوں نے خمریات کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔ وہ سیتا پور میں 1853 میں پیدا ہوئے اور 1934 میں وفات پائی۔ انھوں نے خیرآباد سے ''ریاض الاخبار'' نکالا۔ انھیں صحافت سے دلچسپی تھی پھر گورکھ پور کو اپنی صحافتی کوششوں کا مرکز بنایا۔ یہاں انھوں نے پولس کی ملازمت بھی کی۔ ان کے رسائل گل کدہ ریاض اور گل چین بھی جاری تھے۔ انھوں نے رینالڈ کی ناولوں کا ترجمہ بھی کیا۔ 1907 میں وہ لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں انھوں نے اصلاح سخن کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کی۔ انھوں نے دیوانِ غالب کو اپنا رہنما بنایا تھا لیکن حقیقت میں غالب کی مشکل پسندی، معنی آفرینی، فکر کی تہہ داری اور ان کی

کائناتی بصیرت کا احاطہ کرنا ریاض کے بس کی بات نہیں تھی۔ ریاض نے پہلے آشفتہ تخلص اختیار کیا تھا۔ خمریات کے شاعر ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری شراب کے لوازمات، مئے نوشی کی کیفیات اور اس کی مناسبات و متعلقات کے گرد گھومتی ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا فلسفہ یہ ہے کہ حال ہی سب کچھ ہے۔ ماضی بیت گیا اور مستقبل کے بارے میں ہمارے اندازے ہمیشہ صحیح ثابت نہیں ہوتے۔ ان کے اشعار میں بدمستی، رندانہ طور طریق اور کیف و سرور میں کھو جانے کا رجحان نمایاں ہے۔ انھیں شراب اور شباب میں ایک ازلی اور ابدی رابطہ نظر آتا ہے۔ ریاض خیرآبادی کے کلام میں عشقیہ تجربات، محبت کی کسک اور وارداتِ عشق کی ترجمانی کرنے والے ایسے متعدد اشعار ملیں گے جو اردو کی غزلیہ شاعری کے سرمایہ میں اضافہ ہیں۔

حسرت موہانی 1881 میں ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئے اور 1951 میں وفات پائی۔ سید فضل الحسن حسرت کے آبا و اجداد نیشا پور (ایران) سے ہندستان وارد ہوئے تھے۔ حسرت نے علی گڑھ سے اعلا تعلیم حاصل کی تھی۔ اسٹوڈینٹ یونین کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ انھوں نے اپنی حریت پسندی کی وجہ سے قید کی صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ اردوئے معلیٰ جاری کیا۔ کانگریس سے وابستہ رہے۔ جمعیۃ العلما کے بانیوں میں سے تھے۔ دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے رکن رہے۔ وہ سچے نیشنلسٹ تھے۔ مسلم لیگ سے بھی وابستہ رہے اور اشتراکیت سے بھی اثر قبول کیا۔ ان کی شاعری نشاط و سرور کا پیکر ہے۔ ان کی غزلیں روایتی انداز کے تسلسل کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک جدید، نیاپن اور تازگی رکھتی ہیں۔ ان کے یہاں مومن کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ ان میں اردو شاعری کو پرکھنے کی تنقیدی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کے کلام میں لکھنؤ اور دہلی کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے یہاں محبوب کا تصور مادی اور ارضی ہے۔ ان کی شاعری کا قابلِ لحاظ حصہ عشق و عاشقی کی حرف و حکایات پر مبنی ہے۔ نکات سخن میں انھوں نے اچھی شاعری کے معیاروں سے بحث کی ہے۔ حسرت کے کلام میں فلسفیانہ موشگافیاں کم ملتی ہیں۔ انھوں نے اچھے نقاد ہونے کا ثبوت نکاتِ سخن کے علاوہ محاسن سخن اور معائب سخن میں دیا ہے۔ اردوئے معلیٰ کی تحریریں بھی شعری ذوق کی تربیت میں رہنمائی کرتی ہیں۔

فانی بدایونی 1879 میں اسلام نگر ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے اور 1941 میں رحلت فرمائی فانی کی شاعری اثر انگیز، الم پسند اور منفرد لب و لہجے کی شاعری ہے۔ انھوں نے 1901 میں بی۔ اے کیا وزیرآباد اور اٹاوہ کے ہائی اسکول میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا اور سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول بھی مقرر ہوئے۔ 1915 میں علی گڑھ سے ایل۔ ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی۔ والدین کے انتقال کے بعد لکھنؤ سے بدایوں واپس آ گئے۔ پھر اٹاوہ میں وکالت شروع کی۔ آگرہ کا بھی سفر کیا۔ حیدرآباد بھی گئے۔ وہاں سے واپس آگرہ آ کر مانی جائیسی اور مخمور اکبرآبادی کے تعاون سے "نسیم" رسالہ شروع کیا جو تین برس بعد 1933 میں بند ہو گیا۔ تمام عمر پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ ان کے دو فرزند سعادت علی خاں اور وجاہت علی خاں تھے۔ ان کے کلام کے چار مجموعہ شائع ہوئے جو اس طرح ہیں دیوان فانی، باقیات فانی، عرفانیاتِ فانی اور وجدانیات فانی۔ فانی بدایوں نے اپنے کلام سے حیات عشق اور زندگی غم کو نئے آداب سکھائے اور جذبات الم کو نئی زبان اور اظہار کا اچھوتا انداز عطا کیا۔ فانی کو شہرت کم ملی اور قدر بہت۔ ان کی پوری شاعری اور زندگی پر ایک پرسوز اور رقت انگیز کیفیت چھائی ہوئی

یادداشتیں

ملتی ہے۔ زخم خوردگی کا ایک بے پناہ احساس ملتا ہے۔ انھوں نے حیدر آباد ریڈیو اسٹیشن سے تقریر میں اپنے تصورِ شعر پر روشنی ڈالی، جس میں انھوں نے شعریت کو شاعری کی پہلی اور آخری شرط قرار دیا ہے۔ فانی کی زندگی میں حسرت و یاس نے مستقل جگہ بنالی تھی۔ موت نے ان کے گھر کو اپنا ہدف قرار دیا تھا۔ بنت عم، والد، والدہ، بیٹی، رفیقۂ حیات اور محبوبہ کا غم ایسا نہ تھا جو وقتی صدمہ ثابت ہوتا۔ انھوں نے اپنے کو پرستار شب ہجر اور اپنی زندگی کو الم جاں گداز، داستانِ غم، شب انتظار اور وجود درد سے تعبیر کیا ہے۔ زندگی غم سے عبارت ہے اور اسی کی بدولت جہات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ فانی کے یہاں غم چار مختلف صورتوں میں رونما ہوا ہے۔ غمِ جاناں، غمِ دوراں، غمِ ہستی اور غریب الوطنی کا غم۔ ان کے اندازِ ترسیل کا ایک وصف ڈرامائیت بھی ہے۔ جیسے ان کی حرکی اور بصری امیجری نے تقویت دی ہے۔ اردو غزل فانی کی تاثیر و تعبیر اور حیرت انگیز روانی و چستی، بے ساختگی اور احساس کی شدت و گہرائی یاد رکھے گی۔

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری 1896 کو گورکھپور میں پیدا ہوئے اور وفات 1983 میں ہوئی۔ وہ اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد الٰہ آباد چلے آئے اور میور سنٹرل کالج سے بی۔ اے کیا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد جدو جہد آزادی میں شریک ہوئے اور جیل بھی گئے۔ آگرہ جیل میں شعر و ادب کے دلدادہ قیدیوں نے ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا وہاں فراق نے بھی غزل پڑھی۔ وہ اپنی شاعری سے خوش نہیں تھے جس کا اظہار اپنی نظم ہنڈولہ میں کیا ہے۔ 1930 میں انگریزی سے ایم۔ اے کیا اور الہ آباد یونی ورسٹی میں ملازمت کی۔ کئی ایوارڈ سے نوازے گئے ان میں گیان پیٹھ ایوارڈ بھی شامل ہے۔ فراق ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے نظم، غزل اور رباعی میں اپنے فکر و فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ نثر میں تاثراتی تنقید کے منفرد نقاد تصور کیے جاتے ہیں۔ انھیں مضمون نگاری، مکتوب نگاری اور افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عشق کا رشتہ زندگی کے دوسرے معرکوں اور دلچسپیوں سے استوار کیا۔ وہ اردو کے کلاسیکی شعرا سے کافی متاثر تھے۔ انھوں نے انگریزی ادب اور بالخصوص رومانی دور کے شعرا سے حیات و کائنات کی ہم آہنگی کا ادراک حاصل کیا۔ ہندی شاعری کے توسط سے فراق ہندستانی معاشرے کے جوہر پاروں سے روشناس ہوئے۔ وہ ارضی حسن اور مادی تجربات عشق کے شاعر ہیں۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ہر دور کا ادبی مزاج، نئے تلازموں، نئے استعاروں اور نئی پیکر تراشی کا متلاشی ہوتا ہے۔ فراق کے خوبصورت تخیل، ان کا جمالیاتی حسن، مقامیت اور ہندی و سنسکرت ادب کے فیضان نے ان کی تشبیہوں کو نکھارا ہے۔ انھوں نے محبوب کے سراپے، اس کے حسن کی دلآویز تصویروں اور اس کے شباب کی سحر ترازیوں کو شعر کے پیکر میں سمو دیا ہے۔ فراق کی برجستہ اور دلآویز تشبیہات، استعارات اور خوبصورت سمعی اور بصری پیکروں نے ان کی رباعیوں کو دلنشیں بنا دیا ہے۔ ان کی رباعیوں میں سنسکرت کے سنگار رس اور ہندی کے ریتی کال کی شاعری کے عناصر ہم آمیز ہو گئے ہیں۔ روپ فراق کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔

جگر مراد آبادی کی پیدائش بنارس میں 1890 میں ہوئی اور 1960 میں وفات پائی۔ انھوں نے غزل کو سنوارا اور نکھارا۔ وہ مجسم غزل تھے۔ بیسویں صدی میں جب غزل پر تہمتیں لگائی جا رہی تھیں اور اس کی آبرو خطرے میں تھی۔ حسرت، فانی اور اصغر کے ساتھ جگر نے بھی اُسے حیات نو عطا کی اور اس کا احیا کیا۔ جگر کا خاندان دہلی سے

ہجرت کر کے مراد آباد میں آباد ہو گیا تھا۔ لکھنؤ کے پبلک اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ نویں جماعت میں دو مرتبہ فیل ہوئے۔ عربی و فارسی میں استعداد پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ پہلی رفیقہ حیات سے علاحدگی کے بعد نسیم سے دو بار عقد کیا۔ شراب نوشی سے توبہ کر کے صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔ حج بھی کیا۔ انھیں پدم بھوشن کا خطاب بھی ملا۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی۔ ''آتشِ گل'' پر ساہتیہ اکادمی سے پانچ ہزار کا انعام بھی ملا۔ جگر کے اساتذہ میں داغ دہلوی اور نسیم لکھنوی کے نام لیئے جاتے ہیں۔ جگر حسن و عشق کے نغمے گانے والے شاعر ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا سب سے خوبصورت محرک اور سب سے عظیم حقیقت جمال ہے۔ جگر کی عشقیہ شاعری میں سرستی، سر بلندی، بیزاری اور رجائیت کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ آتشِ گل جگر کے ذہنی انقلاب کی ترجمان ہے لیکن یہ انقلابی شاعری نہیں بلکہ انسانیت سے بے پناہ محبت اور اس کی توجہ کی طرف منسلک ہے۔ داغ جگر اور شعلہ طور سب میں فکر واحساس کی بہت سی منزلوں کے نشان ملتے ہیں اور ہر منزل پر احترام انسانیت ہے۔ جگر نے غزل کی محبت میں نظم نگاروں کو ''ناظم'' کہا تھا لیکن انھوں نے ''سوراج''، گاندھی جی، تلک اور مولانا محمد علی جوہر پر اچھی نظمیں کہی ہیں۔ جگر کے بعض اشعار داغ کے تغزل کے قریب نظر آتے ہیں۔ لیکن جگر اور داغ کے فکر و احساس کی سطح اور ان کے میلانات میں خاصا اختلاف ہے۔ جگر کے کلام میں خوبصورت تلازموں اور ترسیل کے دلنواز پیکروں اور اچھوتی اور خوبصورت ترکیبوں کی کمی نہیں۔ جگر کا تغزل اپنے کیف جمالیاتی رچاؤ اور نکھار کی وجہ سے ان کی پہچان بن گیا ہے۔

شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی 1896 میں پیدا ہوئے اور 1982 میں وفات پائی۔ بیسویں صدی میں جدید اردو نظم پر دیر پا اثرات مرتب کرنے والوں میں اقبال کے بعد جوش کا نام لیا جاتا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شاعری کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس کی توسیع بھی کی۔ وہ شاعر فطرت اور شاعر انقلاب کہلاتے ہیں۔ نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ گھر کا ماحول شعر وادب کے چرچوں سے معمور تھا۔ انھوں نے شروع میں غزلیں کہیں تھیں جو اپنا رنگ نہ جما سکیں۔ تلاش روزگار کے سلسلے میں حیدر آباد کا قصد کیا اور دارالترجمہ سے منسلک ہو گئے۔ کئی ترجمے بھی کیئے۔ ترکِ حیدر آباد کے بعد دہلی سے رسالہ ''کلیم'' جاری کیا۔ فلموں میں گیت لکھے اور سرکاری رسالہ ''آجکل'' میں مدیر اعلیٰ کے طور پر کام کیا۔ جوش ملیح آبادی 1956 میں پاکستان چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ جوش کی شاعری خاصے طویل عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران اردو شاعری نے مختلف رجحانات کو اپنایا۔ کلاسیکیت سے دور ہوتے عناصر کے بعد رومانیت اور ترقی پسند میلانات اردو ادب سے روشناس ہوئے۔ ان تینوں باتوں کا عکس جوش کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ابتدائی کلام میں کلاسیکی اقدار کی پائیداری ہے۔ مغرب کی رومانی تحریک کی پرچھائیاں جب ہندستانی ادب پر پڑنے لگیں تو جوش نے بھی اس سے اثر قبول کیا۔ انسان اور فطرت کے ربط کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ انھیں منظر نگاری پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ نئی تشبیہات، اچھوتے استعاروں اور تلازموں کی معنویت، جدید اور پر اثر ترکیبیں، الفاظ کی مزاج شناسی اور حروف واصوات سے بنائے ہوئے نقوش جوش کی تصویروں کو متحرک بنا دیتے ہیں۔ جوش کی بہت سی نظمیں اردو کی منظریہ شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ جوش کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ الفاظ واصوات کی صوتی قدر و قیمت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ انھوں

یادداشتیں

نے اپنی اسی صلاحیت کی بدولت فضا آفرینی میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کے مرکبات میں تہہ داری موجود ہے۔ جوش کی نظموں میں طنز کی کاٹ بہت تیز ہے جس کے پیچھے وطن پرستی اور حریت پسندی کا جذبہ کارفرما ہے۔ ان کا دل حب الوطنی سے معمور ہے۔ ان کی نظموں نے جنگ آزادی میں صور اسرافیل کا کام کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام اور نظام نو اور انسانیت کا کورس نظموں میں ان کی انقلابیت اور رومانی شخصیت ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی ہے۔ جوش کے طرزِ دامن میں صنعت تکرار اور تنسیق الصفات کا بے مثل صرف ہوا ہے۔ اس سلسلے میں شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، جنوں وحکمت، فکر ونشاط، عرش وفرش، الہام وافکار وغیرہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش نے بے تکان شاعری کی ہے۔ انھوں نے رباعیاں بھی کہی ہیں اور مرثیہ بھی لکھے ہیں۔ آواز حق، حسین اور انقلاب اور مجرد مرثیے ان کے مخصوص نقطۂ نظر کے ترجمان ہیں۔ جوش نے آزادی کی جدو جہد کو معرکہ کربلا سے نسبت دے کر انقلابی تصورات اور تحریک آزادی کو مہمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوش کے نثر کے نمونے ''روح ادب'' کے حصہ نثر میں ان کے انشائیوں کی شکل میں شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین کو 'اشارات'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

## 7.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں

1. آپ نے جدید اردو شاعری کے رجحانات ومیلانات کا پتہ لگایا۔
2. آپ نے جدید عہد کے اہم شاعروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
3. آپ نے جدید اردو شاعری کی اصناف اور موضوعات کا جائزہ لیا۔
4. جدید اردو شاعری کی قدرو قیمت متعین کی۔

## 7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. جدید عہد کے اہم شاعروں کے نام بتائیے۔
2. اس عہد میں اردو شاعری کی کس صنف پر خصوصی توجہ دی گئی۔
3. اس عہد کے کلاسیکی شاعری کے کون علمبردار تھے۔
4. اس عہد میں قصیدہ نگاری کے زوال کی وجہ کیا تھی۔

## 7.6 سوالوں کے جوابات

1. اس جدید عہد کے اہم شاعر یہ ہیں:

محمد حسین آزاد، سرور جہاں آبادی، الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی، اکبر آلہ آبادی، برج نارائن چکبست، شاد عظیم آبادی، سر محمد اقبال، تلوک چند محروم، مرزا داغ دہلوی، ریاض خیر آبادی، حسرت موہانی، فانی

بدایونی، جوش ملیح آبادی اور نظم طباطبائی وغیرہ۔

2. اس عہد میں جدید نظم کا ارتقا ہوا۔ محمد حسین آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی اس کے بانیوں میں تھے جنھوں نے نظیر اکبر آبادی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اقبال، اکبر الہ آبادی، چکبست اور جوش نے اپنی شاعری سے اس صنف کو عظمت بخشی۔

3. اس عہد کی کلاسیکی شاعری کے علمبرداروں میں فانی، جگر، حسرت اور داغ دہلوی تھے۔ جنھوں نے غزل کی آبرو رکھی اور جدید۔ وقدیم رنگ کو اپنی غزلوں میں سمویا۔ ریاض خیر آبادی نے بھی اپنی خمریات سے ایک نئے موضوع کا غزل میں اضافہ کیا۔

4. قصیدہ نگاری کے زوال کی وجہ بادشاہت کا خاتمہ تھا۔ نوابیت اور برطانیہ کے صاحبِ اقتدار لوگوں کی شان میں چند قصیدے ضرور کہے گئے جن کی حیثیت واجبی سی تھی۔ یہ فن سودا، ذوق اور غالب کے بعد زوال پزیر رہا اور جدید شاعری کے دور میں اس صنف نے دم توڑ دیا۔

## 7.7 کتب برائے مطالعہ

1. تاریخ ادب اردو = جمیل جالبی
2. دبستانِ دہلی = نصیر الدین ہاشمی
3. تاریخ ادب اردو = سیدہ جعفر

# اکائی نمبر 8 حسرت موہانی کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ

## ساخت


8.1 اغراض و مقاصد

8.2 تمہید

8.3 حسرت موہانی کی شاعری

8.3.1 حسرت موہانی کا تعارف

8.3.2 حسرت موہانی کی شعری خصوصیات

8.3.3 حسرت موہانی کی غزلوں کی تشریحات

(i) نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے

(ii) روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام

8.4 آپ نے کیا سیکھا

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

8.6 فرہنگ

8.7 سوالوں کے جوابات

8.8 کتب برائے مطالعہ


## 8.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

- حسرت موہانی کے حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- حسرت موہانی کے کلام کی خصوصیات کو بیان کرسکیں گے۔
- حسرت موہانی کے ہم عصر شعرا کے بارے میں جان سکیں گے۔
- حسرت موہانی کی غزلوں کے موضوعات اوران کے برتنے کے طریقۂ کار سے واقف ہوں گے۔
- حسرت موہانی کی دوغزلوں کی تشریح کو سمجھ سکیں گے۔

## 8.2 تمہید

حسرت موہانی کا زمانہ 19 ویں صدی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا نصف اوّل کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ سیاسی، معاشی اور ادبی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وہ دور ہے جب سرسید اور حالی کی اصلاحی تحریک زندگی کے ہر شعبے میں مثبت طور پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ لوگ ادب کی افادیت کے قائل ہو گئے تھے۔ شاعری کا مزاج یکسر بدل چکا تھا۔ لوگوں کی توجہ غزل سے ہٹ کر نظم اور نظم جدید کی طرف زیادہ ہوگئی تھی۔ شاعری میں ہیئت

اور موضوعات کے اعتبار سے نئے نئے تجربے ہو رہے تھے۔ ایسے میں مکمل آزادی کے طلب گار، قوم کے خدمت گزار اور ادب کے پرستار حسرت موہانی نے اردو شاعری کے چمن میں قدم رکھا اور شاعری کے اس شجر کی آبیاری کرکے اُسے نئی زندگی بخشی اور خالص عشقیہ شاعری میں اپنی فکر کا ایوان تعمیر کیا۔ سیاست کے ساتھ شاعری اور وہ بھی غزل کی روایات کو برقرار رکھنا ایک مشکل کام تھا لیکن حسرت نے اسے ممکن کر دکھایا۔ انھوں نے غزل کی آبرو اس وقت رکھ لی جب یہ بہت بدنام اور ہر طرف سے نرغے میں تھی۔ حسرت کے ہم عصر شعرا میں، جنھوں نے غزل کی طرف توجہ کی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ سبھی شعرا انفرادی رنگِ طبیعت کے مالک ہیں لیکن ان میں حسرت کا رنگ سب سے نمایاں ہے۔

## 8.3 حسرت موہانی کی شاعری

### 8.3.1 حسرت موہانی کا تعارف

حسرت موہانی کا پورا نام سید فضل الحسن تھا۔ وہ 1881 میں ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک زمین دار اور علمی گھرانے سے تھا۔ زمانے کے رواج کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم گھر اور مکتب میں ہوئی۔ 1894 میں موہان مڈل اسکول سے مڈل اور 1898 میں گورنمنٹ ہائی اسکول، فتح پور سے انٹرنس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ عربی و فارسی کی تعلیم بھی یہیں مکمل ہوئی۔ 1898 میں علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (M.A.O. College) میں ایف۔ اے۔ میں داخلہ لیا جو ان کی زندگی کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ حسرت کی نرالی وضع قطع اور ان کے ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں پاندان دیکھ کر علی گڑھ کے لڑکے انھیں 'خالہ جان' کے لقب سے پکارتے تھے لیکن اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور لیاقتوں کی بنا پر بہت جلد انھوں نے وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک خاص جگہ بنالی اور مولانا کے نام سے یاد کیے جانے لگے۔ وہ کالج یونین کے جلسوں میں تقریریں کرتے، مباحثوں میں حصّہ لیتے، مشاعروں میں غزلیں پڑھتے۔ وہ بات کے دھنی اور اصولوں کے پکے تھے۔ غلط بات گوارا نہیں کرتے تھے۔ انھیں غلامی اور انگریزی حکومت سے سخت نفرت تھی۔ اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے بہت جلد علی گڑھ کے سامراج نواز حلقے کے لیے ایک مسئلہ بن گئے تھے۔

حسرت موہانی دو سال تک 'انجمن اردوئے معلّٰی' کے ناظم رہے۔ 1903 میں انھوں نے اس انجمن کے تحت ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں غیر اخلاقی شعر پڑھے جانے کا الزام لگا کر انھیں کالج سے نکال دیا گیا لیکن بی۔اے۔ کے امتحان میں شرکت کی اجازت مل گئی تھی۔ چنانچہ علی گڑھ شہر کے محلّہ رسل گنج میں کرائے کا مکان لے کر رہنے لگے اور امتحان میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد انھیں LLB میں داخلہ مل گیا تھا لیکن ہاسٹل میں رہنے کی اجازت نہ ملنے اور وکالت کا پیشہ مزاج کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے ارادہ ترک کر دیا۔ لہٰذا ملک وقوم کی خدمت کرنے اور شعر وسخن کو فروغ دینے کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اب ان کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

1903 میں خاندان کی ایک تعلیم یافتہ خاتون نشاط النسا بیگم سے ان کی شادی ہوئی جو ہر مشکل گھڑی میں حسرت کو سہارا دینے اور ان کے حوصلے کو بلند رکھتیں۔ اسی سال انھوں نے رسالہ 'اردوئے معلّٰی' جاری کیا۔ 1905

میں وہ سودیشی تحریک میں شامل ہوگئے اور اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزوں کے استعمال کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے خود اس پر عمل کیا اور اس کے لیے ایک سودیشی اسٹور بھی کھولا۔ مشکل حالات میں بھی انھوں نے اسے کامیابی سے چلایا۔ وہ ایک عملی آدمی تھے۔ قومی بھلائی کے لیے ہر کام میں دل و جان سے شریک رہتے۔ حق بات کہنے کے لیے کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ انتہائی بے باک تھے۔

'اردو معلّٰی' کے اپریل 1908 کے شمارے میں ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں ان پر مقدمہ چلا۔ دو سال قید با مشقت کی سزا ہوئی اور پانچ سو روپے جرمانہ جس کے لیے ان کا قیمتی کتب خانہ کوڑیوں کے بھاؤ نیلام کر دیا گیا۔ حسرت کے باغیانہ خیالات اور پر جوش طبیعت کی بنا پر اب انگریزی حکومت انھیں پریشان کرنے کے لیے طرح طرح کے بہانے تلاش کرنے لگی۔ 1913 میں ان کا پریس تین ہزار روپے کی ضمانت کے بدلے ضبط کر لیا گیا۔ 1916 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مخصوص کردار کی بحالی کے لیے آواز اٹھانے پر وہ دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ رہائی کے بعد ان کے سیاسی خیالات میں مزید شدت پیدا ہوگئی اور آزادی کی جدوجہد میں پوری طرح لگ گئے۔ سیاسی اعتبار سے وہ کانگریس کے انتہا پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تحریکِ آزادی کو 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دینے والے حسرت موہانی ہی تھے۔ اسی دوران ان کی توجہ خلافت تحریک اور ترکِ موالات کی طرف بھی ہوگئی تھی۔ دسمبر 1921 میں انھوں نے ہندوستان کی 'مکمل آزادی' کی تجویز اس وقت پیش کی جب مہاتما گاندھی جیسے رہنما اس خیال سے کوسوں دور تھے۔ 1922 میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارتی تقریر پر ان پر مقدمہ چلا اور دو سال کے لیے تیسری اور آخری بار وہ پھر گرفتار کر لیے گئے۔ ان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے بھی تھا لیکن آخر عمر تک وہ ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ ان کے جذبۂ آزادی کو دیکھتے ہوئے انھیں 'رئیس الاحرار' کے خطاب سے نوازا گیا۔ 1946 میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی کے اور آزادی کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے۔ انھوں نے گیارہ حج کیے لیکن انتہائی سادگی کے ساتھ، 13 مئی 1951 کو ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ ان کا مزار فرنگی محل کے قبرستان میں ہے۔

حسرت نے سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی سرگرمیاں بھی برابر جاری رکھیں۔ تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل تیرہ دیوان یادگار چھوڑے۔ شاعری کی خوبیوں اور خامیوں سے متعلق ان کی تین کتابیں — متروکاتِ سخن، مصائبِ سخن اور محاسنِ سخن — بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ 'انتخابِ سخن' کے نام سے سو سے زیادہ شاعروں کے کلام کا انتخاب گیارہ حصوں میں شائع کرایا۔

### 8.3.2 حسرت کی شعری خصوصیات

حسرت ایک کامیاب سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اگرچہ ان کی زندگی میں مصیبتوں اور پریشانیوں کی کمی نہ تھی لیکن شاعری میں بجز دو ایک شعر کے، کہیں پریشانیوں کا ذکر نہیں ملتا۔ انھوں نے جینے کا عجب ڈھب نکالا تھا۔ چکّی کی مشقت اور مشقِ سخن میں انھوں نے کچھ ایسی مطابقت، پیدا کر لی تھی کہ ان کے لیے دونوں لازم و ملزوم ہوگئے تھے۔ بارہ برس کی عمر میں انھوں نے شاعری کی ابتدا کی اور تخلّص 'حسرت'

اختیار کیا۔ شہرت اسی نام سے بھی ملی ان کا خود خیال ہے۔

عشق نے جب سے کیا حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

حسرت کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ غزل کے مردہ جسم میں انھوں نے نئی روح پھونکی اور تقریباً نصف صدی تک سب سے بدنام صنفِ سخن میں تازگی اور ترنم کا رنگ بھرتے رہے۔ غزل حسرت کی عشقیہ شاعری کا محور ہے جس کے گرد ان کے تمام تصورات گردش کرتے ہیں۔ حسرت کو غزل سے ایک خاص مناسبت ہونے کی وجہ ان کی اپنی طبیعت کی یک رنگی تھی اور یہی سبب ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے حسرت کی شاعری کافی حد تک یک رنگی کی شکار ہے۔ حسرت کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ان کا انداز بیان ہے جس کی وجہ سے پرانے خیالات بھی نئے معلوم ہوتے ہیں اور پڑھنے والا ایک نئی کیفیت سے آشنا ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور دل پر اثر کرنے والی کیفیت نمایاں ہے۔ ان کا شاعرانہ اصول یہ تھا کہ ؎

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

حسرت کا کلام ذاتی محسوسات، جذبات اور واردات کا آئینہ دار ہے۔ ماورائیت اور آفاقیت کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لب و لہجے میں صداقت ہے، پورے کلام میں رنگینی اور بیان کی شیرینی کی فضا قائم ہے جو عشق و محبت کی مختلف کیفیات کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کا تصورِ عشق فلسفیانہ اور روایتی نہیں بلکہ مادی اور حقیقی ہے۔ ان کا محبوب گوشت پوست کا بنا ایک انسان یعنی کائنات کی لطیف جنس عورت ہے۔ جذبات کے اظہار میں حسرت نے متانت اور سنجیدگی کا پورا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو ہوس ناکی اور ابتذال کی ہوا نہیں لگنے دی۔ اس میں ایک طرح کا وقار، خلوص، پاکیزگی اور اخلاق سبھی کچھ موجود ہے۔ دل کش اور حسین تراکیب بھی حسرت کے کلام کی ایک نمایاں خوبی ہے اس سے کلام میں ترنّم، روانی اور صوتی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے میر، غالب، مومن، مصحفی، نسیم تقریباً سبھی اساتذہ سے فیض اٹھایا ہے اور ان سبھی کے رنگوں کو ملا کر اپنا ایک الگ رنگ بنایا ہے۔ ان کی شاعری دہلی کی بہ نسبت لکھنوی دبستان سے زیادہ قریب ہے۔ ان کی طویل شعری خدمات کی بنا پر انھیں 'رئیس المتغزلین' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

### 8.3.3 حسرت موہانی کی غزلوں کی تشریحات

## غزل 1

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے سازباز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

## تشریح

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

شاعر کا خیال ہے کہ محبوب یا دوست کی محبت بھری نگاہ جس پر پڑ جائے اور وہ اسے اپنا رازداں بنالے تو پھر ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عاشق اپنی قسمت کی بلندی پر ناز نہ کرے۔ یعنی اسے اپنے اوپر فخر اور غرور کرنے کا سراسر حق ہے کہ اسے کسی نے محبت اور جادو بھری نگاہ سے دیکھا ہے اور اپنا ہم راز بنایا ہے۔

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

عاشق اپنے معشوق کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تیری محبت سے پیدا شدہ دیوانگی نے میرے دل کو دنیا جہاں کے غموں سے نجات دلا دی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تیری محبت سے ملنے والا غم مجھ پر اتنا حاوی ہو گیا ہے کہ اس کے آگے دنیا جہان کے غموں کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور مجھے اس میں ایک طرح کا کیف و سرور حاصل ہو رہا ہے۔ لہٰذا خدا سے میری دعا ہے کہ میرے دل میں تیری محبت اور چاہت کا یہ سلسلہ طویل سے طویل تر ہو جائے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یادداشتیں

اس شعر کے پہلے مصرعے میں صنعتِ تضاد ہے جسے خرد اور جنون جیسے لفظوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ تیرے حسن و جمال یعنی خوب صورتی میں کرشمے جیسا اثر ہے۔ اس اثر کی وجہ سے دیوانگی اور ہوش وخرد میں امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شاعر یہی کہنا چاہتا ہے کہ جو تجھے ایک بار دیکھ لے وہ دیوانہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کے لیے دیوانگی اور ہوش مندی میں فرق کرنا مشکل ہو جائے گا۔

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

اردو شاعری میں عام طور پر محبوب کو ستم پیشہ اور جفا شعار یعنی ظلم وستم کرنے والا سمجھا گیا ہے۔ اسی نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ تیرے ستم سے، جو ایک طویل عرصے یا ابتدائے عشق سے جاری ہے، میں ناراض ہونے کے بجائے خوش ہوں کہ شاید اسی بنا پر اللہ تعالیٰ مجھے امتیازی حیثیت رکھنے والوں یعنی خاص بندوں میں شامل کر لے۔ دوسرے لفظوں میں تیرے ستم کو نالہ و فریاد کیے بغیر سہتے رہنے سے میری قدر و قیمت میں اضافہ ہو جائے گا۔

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

شاعر کہتا ہے کہ جو شخص دنیا کے غم سے فرصت پانے یا چھٹکارا حاصل کرنے کا خواہش مند ہے اسے چاہیے کہ وہ محبوب کے دامن سے وابستہ ہو جائے۔ یعنی محبت سے ملنے والے درد وغم میں مبتلا ہو جائے۔ ان سے سمجھوتہ کر لے۔ دنیا کے غم کی پھر کوئی حقیقت نہیں رہ جائے گی۔ معنی کے اعتبار سے یہ شعر دوسرے شعر سے ملتا جلتا ہے۔

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

شاعر کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی نگاہِ کرم اور محبت کی وجہ سے ہر طرف اس کے چاہنے والوں کا ہجوم ہے۔ شاعر کے لیے یہ بات حیرانی بلکہ کسی قدر رقابت کا سبب بنی چاہیے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ دعا گو ہے کہ محبوب کی نگاہ زیادہ سے زیادہ دل نوازی یعنی لوگوں کو خوش کرنے کا سبب بنے۔ عشق مجازی کے علاوہ اسے تصوف اور عشق حقیقی کے پس منظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

مقطع میں شاعر نے اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا ہے۔ محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ میں تیرے کرم کا حق دار بالکل نہیں ہوں۔ لیکن مایوس بھی نہیں ہوں۔ اب آگے تیری مرضی اور خوشی ہے یعنی تجھے اختیار ہے کہ میرے درجات بلند کرے یا نہ کرے۔ یہاں لفظ 'خوشی' سے محبوب کی اعلاظرفی کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ وہ یقیناً سرفراز کر کے رہے گا۔ یعنی اپنے کرم کا مستحق مجھے بھی سمجھے گا۔

## غزل2

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حسن سے، شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دل خون ہو چکا ہے، جگر ہو چکا ہے خاک
باقی ہوں میں، مجھے بھی کرے اے تیغ زن تمام

دیکھو تو چشم یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبِّ وطن تمام

سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

شیرینی نسیم ہے سوز و گدازِ میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

## تشریح

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

شاعر اپنے محبوب کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کے جمال یعنی خوب صورتی سے پوری انجمن خود بخود روشن ہوگئی ہے۔ دوسرے مصرعے میں ’آتش گل‘ استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد محبوب کا سرخ اور تمتماتا ہوا چہرا ہے۔ شاعر نے محبوب کے چہرے کو گلاب کہا ہے اور گلاب آگ کی مانند سرخ ہوتا ہے۔ لہٰذا محبوب کے حسین چہرے سے پورا چمن یعنی انجمن مہک گئی ہے یعنی روشن ہوگئی ہے۔ اس شعر کو عشق حقیقی کے تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

یادداشتیں

حیرت غرورِ حسن سے، شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

یہاں شاعر نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ عاشق کی ذات میں معشوق کا عکس نمایاں ہوگیا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ عاشق کو معشوق کی ہر ادا پسند ہوتی ہے اور ان اداؤں سے وہ نہ صرف لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ اسے ایک طرح کی طمانیت اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ محبوب کو اپنی خوب صورتی کے احساس سے ایک طرح کا تکبر اور غرور پیدا ہوگیا ہے جس پر عاشق کو حیرت اور اس کی شوخیوں اور اداؤں سے بے چینی ملی ہے۔ یعنی عاشق کے دل نے محبوب کے تمام طور طریقے اختیار کر لیے ہیں۔

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیر ہن تمام

جسم یار سے مراد دوست یعنی محبوب کا جسم یا سراپا ہے۔ پیرہن بمعنی لباس۔ شاعر اپنے محبوب کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اتنا خوب صورت ہے کہ کوئی بھی لباس پہن لے تو وہ خود بخود رنگین یعنی خوبصورتی کے لیے لباس کا خوب صورت اور رنگین ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ لباس خود محتاج ہے محبوب کی خوبصورتی اور رنگینی کا۔ ترکیب 'اللہ رے' سے شاعر نے اپنی حیرت اور خوشی دونوں کا اظہار کیا ہے۔

دل خون ہو چکا ہے، جگر ہو چکا ہے خاک
باقی ہوں میں، مجھے بھی کرے اے تیغ زن تمام

شاعر عشق و محبت میں اپنے اوپر گزری ہوئی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تیری محبت میں میرے دل کو سخت تکلیف پہنچی ہے اور میرا جگر تباہ و برباد ہوگیا ہے۔ اب میرے جینے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ میری باقی زندگی بھی تیرے ہاتھ میں ہے۔ اب تو مجھے بھی تمام یعنی ختم کر دے۔ یہاں تیغ زن سے مراد محبوب ہے جس کے ناز وغمزہ کا وار کسی تلوار سے کم نہیں ہوتا۔ یہاں شاعر نے ردیف 'تمام' سے بھی کلام میں حسن پیدا کیا ہے جس کا مطلب ہے ختم یا خاتمہ۔

دیکھو تو چشم یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

چشم یار یعنی محبوب کی آنکھوں میں جادو ہی جادو ہے۔ تمام انجمن یعنی محفل کو بے ہوش کرنے کے لیے اس کی ایک نظر ہی کافی ہے۔ 'دیکھو تو' یہاں شاعر نے اپنی حیرت کے اظہار سے محبوب کی جادو بھری نگاہ کو اور پر کشش بنا دیا ہے۔ ایک تو محبوب کا حسن دوسرے جادو بھری یعنی خوبصورت و دلکش نگاہیں۔

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبِّ وطن تمام

یہ شعر حسرت کی سیاسی سرگرمیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اپنی باغیانہ، انقلابی اور پر جوش طبیعت کی وجہ سے کئی بار جیل گئے۔ حکومتِ برطانیہ کی ان پر کڑی نظر تھی اور انھیں طرح طرح سے پریشان کیا کرتی تھی۔ اسی لیے

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

حسرت کہتے ہیں کہ اہلِ جور یعنی ظلم وستم کرنے والے مجھ پر اور سختی کرتے جائیں۔ یہ وطن کے حق میں اچھا ہوگا۔ اگر چہ مجھے اس سے پریشانی اور تکلیف ہوگی لیکن میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ وطن کی محبت کی آگ اور پھیلے گی اور زیادہ سے زیادہ لوگ آزادی کی تحریک میں حصہ لیں گے۔ جس قدر لوگ اس میں شامل ہوں گے اسی قدر یہ تحریک طاقت ور ہوتی جائے گی۔

سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

یہ شعر بھی حسرت کے سیاسی شعور کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حسرت کا زمانہ آزادی کی جدوجہد اور مشرقی و مغربی تہذیبوں کے ٹکراؤ کا زمانہ ہے۔ حسرت اس شعر میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حکومتِ برطانیہ یعنی مغرب کے لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اہلِ شرق یعنی مشرقی تہذیب کے پروردہ اور پیروکار شاید اب مرنے کے قریب ہیں۔ اسی لیے مغرب کے چیل اور کوے ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں کہ مرنے کے بعد یہ ہماری خوراک اور لقمہ بننے والے ہیں۔

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گدازِ میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

حسرت نے اس شعر میں تعلّی سے کام لیا ہے۔ یعنی اپنی شاعری کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ اپنے کلام کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس میں ان کے استاد کے استاد نواب اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے کلام کی شیرینی اور میر کا سوز و گداز سبھی کچھ موجود ہے۔ گویا جس کے کلام میں یہ خوبیاں ہوں اس کی شاعری پر لطفِ سخن تمام یعنی ختم ہو جاتا ہے۔ حسرت کا خیال ہے کہ ان کے بعد کی جانے والی شاعری میں کوئی لطف نہیں رہے گا۔

## 8.4 آپ نے کیا سیکھا

1. حسرت کا سوانحی خاکہ اور ان کی سیاسی زندگی کا پتا چلتا ہے۔
2. حسرت کی شاعری کے موضوعات کا اندازہ ہوتا ہے۔
3. حسرت کے اسلوب کی خصوصیات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔
4. حسرت کی تین غزلوں کی تشریح سامنے آتی ہے۔
5. حسرت کے ہم عصروں میں ان کا درجہ متعین ہوتا ہے۔

## 8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. علی گڑھ میں حسرت کی علمی گرمیاں کیا تھیں؟
2. پہلی غزل کے مطلع اور مقطع کی نشان دہی کیجیے۔
3. دوسری غزل کی ردیف 'تمام' ہے جو پورا، کامل یا کل کے معنی میں استعمال ہوتی ہے لیکن ایک شعر میں

اسے خاتمہ یا ختم کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس شعر کی نشان دہی کیجیے۔

4. پہلی غزل کے کسی ایک شعر کی تشریح کیجیے۔

## 8.6 فرہنگ

| | | |
|---|---|---|
| ناز کرنا | = | غرور کرنا، فخر کرنا |
| خرد | = | عقل |
| کرشمہ ساز | = | ادائیں دکھانے والا، اشارے کرنے والا |
| اربابِ امتیاز | = | امتیازی یا نمایاں حیثیت رکھنے والے لوگ |
| فراغ | = | فرصت |
| دل نواز | = | دل کو تسلی دینے والا، دل کو خوش کرنے والا |
| سزاوار | = | لائق، مستحق |
| سرفراز کرنا | = | عزت افزائی کرنا، سربلند کرنا |
| اضطراب | = | بے چینی |
| پیرہن | = | لباس |
| تیغ زن | = | تلوار چلانے والا |
| اہل جور | = | ظلم وستم کرنے والے لوگ |
| شورش | = | اُودھم، غل فساد |
| مرگ | = | موت |
| زاغ | = | کوّا |
| زغن | = | چیل |
| سوز | = | جلن |
| گداز | = | پگھلاہٹ، پگھلانے والا |

## 8.7 سوالوں کے جوابات

1. حسرت موہانی نے علی گڑھ کے M.A.O. College سے ایف۔ اے۔ اور بی۔ اے۔ کیا۔ وہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر بہت جلد وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں مقبول ہو گئے تھے۔ وہ کالج یونین کے جلسوں میں تقریریں کرتے، مباحثوں میں حصہ لیتے اور غزلیں پڑھتے تھے۔ 'انجمن اردوئے معلّٰی' کے ناظم رہے۔ 'اردوئے معلّٰی' کے نام سے رسالہ جاری کیا اور کئی سال تک پابندی سے نکالتے رہے۔ دوسروں سے مضامین لکھواتے اور خود لکھتے۔

2. پہلی غزل کا مطلع:

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

پہلی غزل کا مقطع :

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

3.

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

4.

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیری محبت سے پیدا شدہ دیوانگی نے میرے دل کو دونوں جہان کے غموں سے نجات دلا دی ہے۔ یہ دیوانگی اب مجھ پر اتنی حاوی ہوگئی ہے کہ دنیا جہان کے غموں کی اب میرے نزدیک کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اب خدا سے یہی دعا ہے کہ میرے دل میں تیری محبت اور چاہت کا یہ سلسلہ، یہ دیوانگی طویل سے طویل تر ہو جائے۔

## 8.8 کتب برائے مطالعہ


1. اردو شاعری پر ایک نظر۔ حصّہ دوم — کلیم الدین احمد
2. حسرت موہانی — مرتبہ ثریا حسین
3. آج کل نئی دہلی 'حسرت موہانی نمبر' — اگست ستمبر۔ 1981
5. مولانا حسرت موہانی — ڈاکٹر اسلم فرخی

# اکائی نمبر 9 فانی بدایونی کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ

## ساخت


9.1 اغراض و مقاصد
9.2 تمہید
9.3 فانی بدایونی کی شاعری
9.3.1 فانی بدایونی کا تعارف
9.3.2 فانی بدایونی کی شعری خصوصیات
9.3.3 فانی بدایونی کی غزلوں کی تشریحات
(i) دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
(ii) مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
9.4 آپ نے کیا سیکھا
9.5 اپنا امتحان خود لیجیے
9.6 فرہنگ
9.7 سوالوں کے جواب
9.8 کتب برائے مطالعہ


## 9.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

- فانی کے حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- فانی کے کلام کی خصوصیات کو بتا سکیں گے۔
- فانی کے ہم عصر شعرا کے بارے میں جان سکیں گے۔
- فانی کی غزلوں کے موضوعات اور ان کے برتنے کے طریقہ کار سے واقف ہوں گے۔
- فانی کی غزلوں کی تشریح کو سمجھ سکیں گے۔

## 9.2 تمہید

جدید غزل گو شعرا میں فانی بدایونی کا نام اردو کے ان ممتاز شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے جنھوں نے اردو شاعری کو ایک نیا لہجہ اور نئی معنویت عطا کی۔ فانی کا زمانہ تیز رفتار سماجی تبدیلیوں کا دور تھا۔ اس دور کے کرب کو فانی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ شعری پیکر عطا کیا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو جذبہ کی شدت اور خیالات کی گہرائی دے کر اسے نئی بلندیوں سے آشنا کیا۔ زبان و بیان کی نزاکتوں اور کلاسکی حسن کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات سے مالا مال کیا۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے لب و لہجہ نے اردو شاعری کو ایک نئی آواز بخشی۔

یادداشتیں

## 9.3 فانی بدایونی کی شاعری

### 9.3.1 فانی بدایونی کا تعارف

شوکت علی خاں فانی کی پیدائش 13 ستمبر 1879 کو ضلع بدایوں کے قصبے اسلام نگر میں ہوئی۔ ان کے دادا غلام نبی خاں بدایوں کے گورنر تھے اور والد شجاعت علی خاں پولیس انسپکٹر تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول، بدایوں سے 1897 میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ 1901 میں بریلی سے بی۔اے۔ کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی۔ 1903 میں ان کی شادی بدایوں کے زمیندار انتظار علی خاں کی بیٹی شاہ زمانی بیگم سے ہوگئی۔ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد ذمہ داری کا بوجھ کندھوں پر آپڑا، اس لیے وزیر آباد ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ 1904 میں اٹاوہ کے اسلامی ہائی اسکول میں تقرر ہوا۔ یہاں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد فانی گونڈہ میں سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر مقرر ہوئے لیکن مزاج کی وحشت اسیری اور پابندی کی متحمل نہ ہوسکی۔ 1906 میں فانی اپنے والد کے مشورے پر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی) میں ایل۔ایل۔بی۔ میں داخلہ لیا اور 1908 میں ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد لکھنؤ، آگرہ، اٹاوہ، بریلی اور بدایوں میں وکالت کی۔ لیکن وکالت کے پیشے میں دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

1931 میں مانی جائسی کی مدد سے آگرہ سے ایک رسالہ ''تسنیم'' جاری کیا۔ 1932 مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کی دعوت پر حیدرآباد چلے گئے۔ مہاراجہ کے دربار سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے حیدرآباد کے ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی ملازمت کی۔ 27 اگست 1941 کو حیدرآباد میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

### 9.3.2 فانی بدایونی کی شعری خصوصیات

فانی کی طبیعت اوائل عمر ہی سے شعر وسخن کی طرف مائل تھی اور بہت کم عمر میں ہی شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ لیکن ان کے والد شجاعت علی خاں شاعری کے سخت مخالف تھے اور ان کے ناراض ہونے کے ڈر سے اپنے شوق کو چھپائے رکھا۔ اسی لیے کسی استاد سے اپنے کلام پر اصلاح نہ لے سکے۔ فانی نے شروع میں شوکت اور بعد میں فانی تخلص رکھا اور اسی نام سے وہ مشہور ہوئے۔ فانی کا بیشتر کلام ضائع ہوگیا، جو کچھ بچا ہے وہ پہلے ''باقیاتِ فانی'' اور بعد میں ''عرفانیاتِ فانی'' کے نام سے شائع ہوا۔

فانی کے کلام کی نمایاں خصوصیات احساس کی شدت، خیال کی گہرائی اور درد انگیزی ہیں۔ فانی نے حسن و عشق کو بھی موضوع سخن بنایا اور تصوف و معرفت کے مضامین کو بھی جگہ دی۔ لیکن ان کا اصل موضوع غم حیات ہے۔ فانی ایک طرف تو اپنے دور کے تہذیبی وسماجی بحران اور شکست وریخت کے المیاتی احساس سے مغلوب تھے تو دوسری طرف خود ان کی ناکام و نامراد زندگی کے تجربات تھے، جس کے نتیجے میں ان کے کلام میں زیست بیزاری، مرگ پسندی اور احساساتِ درد وغم کے نمونے جابجا ملتے ہیں۔ فانی نے موت کے تقریباً ہر پہلو پر طبع آزمائی

کی ہے۔وہ موت کو زندگی کی ساری تکلیفوں سے نجات کا ذریعہ مانتے ہیں اور اسے سرورِ زندگی قرار دیتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ فانی کے کلام میں جنازہ،کفن،نزع،قبر،لاش،مزار،قاتل،شہید،میت وغیرہ موت کے لوازمات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔فانی کے اشعار غم ناک ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک شاعرانہ دلکشی رکھتے ہیں۔ان کے یہاں زبان و بیان کی نزاکتیں،خیال اور جذبہ کا متوازن امتزاج موجود ہے۔لطافتِ زبان اور نزاکتِ اظہار کے معاملے میں فانی دوسرے غزل گو شعرا سے آگے نظر آتے ہیں۔

## 9.3.3 فانی کی غزلوں کی تشریح

### غزل 1

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم!
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

## تشریح

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

شاعر دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے زندگی کو غیر اہم سمجھتا ہے، اس لیے وہ اس کا سودا کرنے کو کسی قیمت پر راضی نہیں ہے۔ نہ اسے یہ معلوم ہے کہ یہ سودا مہنگا ہے یا سستا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں تو ان بے تعلق لوگوں میں ہوں کہ زندگی تو زندگی موت بھی بے قیمت کے ملتی ہو تو اسے بھی نہ لوں۔ اس شعر میں زندگی سے بے نیازی اور موت کو زندگی پر ترجیح دینا قابل غور ہے۔

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں بستیوں کو اجڑتے اور ویرانوں کو آباد ہوتے دیکھا ہے مگر دل ایک ایسی انوکھی بستی ہے جو ایک بار اجڑ جائے تو دوبارہ آباد نہیں ہوتا۔ یعنی اگر دل ٹوٹ جائے تو دوبارہ اسے جوڑا نہیں جا سکتا۔

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے

شاعر کہتا ہے کہ نیست یعنی عدم اور ہست یعنی وجود ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ایک کی شناخت کے لیے دوسرے کی موجودگی ضروری ہے۔ لیکن جو ہستی محض عدم کی نفی ہو اس کی حقیقت ہی کیا ہے اور ایسی ہستی پر بھلا کون بھروسہ کرے۔

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے

شاعر کہتا ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اجالے کی اہمیت اس وقت تک شمار کی جاتی ہے جب تک اندھیرا رہتا ہے اور بلندی کی عظمت اسی وقت تک قائم ہے جب تک پستی موجود ہے۔ اسی طرح اگر گناہگاروں کا اعترافِ گناہ نہ ہو تو پارسائی اور پاکیزگی کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ عصمتِ کامل سے انسان کی پاکیزگی بھی مراد ہو سکتی ہے اور خدا بھی۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کی عاجزی اور گناہ بھی اپنی جگہ اہم ہیں کیونکہ اسی کے ذریعہ سے مالک حقیقی کو سمجھنا ممکن ہے۔

یادداشتیں

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

محبوب کی ایک نظر کے بدلے میں عاشق اپنی جان دینا تک گوارا کرلیتا ہے اور اس سودے کی قیمت بہت کم قیمت پر کیا ہوا سودا سمجھتا ہے۔ اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ محبوب ایک نظر میں اپنے عاشق کی جان خرید لیتا ہے۔ ویسے تو ہم یہ خریدار کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں مگر اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ اس جنسِ گرانمایہ کی قیمت کم ہے۔

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

شاعر کہتا ہے کہ ہوش مندی بری چیز نہیں ہے مگر اہمیتِ عشق سے منکر ہونا گویا خدا کا انکار کرنا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ خدا کے منکر ہیں اور ہوش کے پرستار ہیں۔ شاعر کے نزدیک وحشتِ دل یعنی عشق محبوب سے الگ کوئی شے نہیں ہے۔

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

شاعر کہتا ہے کہ دنیا کی رونق کا سیدھا تعلق دل کی خوشی سے ہے۔ دنیا کی رونق اور آبادی اب بھی ویسی ہی ہے مگر محبوب کے جانے کے بعد ہماری آنکھوں کا یہ حال ہے کہ جیسے ہر طرف سونا پن نظر آرہا ہے اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا ہے۔ فانی نے اس شعر میں جذبات کی بڑی بے پناہ تصویر کھینچی ہے۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

شاعر کہتا ہے کہ محبوب سے جدائی کا غم اس درجہ ہے کہ روتے روتے آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے ہیں اس کے باوجود دل کے بوجھ میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ دل پر ایسی گھٹا چھائی ہے جو نہ کھلنے کا نام لیتی ہے اور نہ برستی ہے یعنی محبوب کے جانے کے بعد عاشق کی طبیعت پر ایک امس اور گھٹا چھائی ہوئی ہے جو کسی طرح کم نہیں ہوتی۔

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تو نے دل کو ذرا سی دیر میں اجاڑ تو دیا ہے مگر کیا تجھے یہ بھی خبر ہے کہ اس کو دوبارہ آباد کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ دل ایک ایسی بستی کی طرح ہے جو ایک بار اجڑ جائے تو دوبارہ آباد نہیں ہوتی۔ اگر ہو بھی تو اس بستی کو بسانے میں بہت مدت لگتی ہے۔

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

شاعر کہتا ہے کہ ہماری آنکھیں جن سے کبھی خون کی ندیاں رواں رہی تھیں اب ان میں آنسوؤں کی دو بوندیں بھی نہیں پائی جاتیں۔ یعنی مجھے اتنے غم ملے ہیں کہ میری آنکھوں نے روتے روتے تمام آنسو اور دل کے خون کو بہا دیا۔ اس شعر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ غم کی انتہا وہ ہوتی ہے جب آنسو بھی خشک ہوجاتے ہیں۔

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

## غزل2

مآل سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

ابھی کیا ہے کسی دن خوں رلا دے گی یہ خاموشی
زبانِ حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

ادھر منھ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو
مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

بہارِ زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھوگے
کسی کا عیش مرگ ناگہانی دیکھتے جاؤ

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

## تشریح

مآل سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

شاعر کہتا ہے کہ غم پنہاں نے رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھایا ہے۔ اب ہمارا انجام نزدیک ہے اور اب زندگی کی شمع بھڑک کر بجھنے والی ہے یعنی ہمارا مرنا بہت نزدیک ہے۔

چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

شاعر کہتا ہے کہ ہم نے تمھاری محبت میں زندگی قربان کردی ہے۔تم اپنے چاہنے والے کی قبر پر ایک نگاہ تو ڈالتے جاؤ۔ میری قبر دور بھی نہیں ہے بلکہ نزدیک ہے۔شاعر اس شعر میں میت اور مدفن کے ذکر کی تکرار کے ایک مخصوص رجحان کی عکاسی ہے۔

ابھی کیا ہے کسی دن خوں رلا دے گی یہ خاموشی
زبانِ حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ

شاعر کہتا ہے کہ ہم ضبط کی وجہ سے خاموش ہیں اور اپنا حال زبان سے نہیں کہتے ہیں مگر ہمارا حال ہمارے غم کی داستان بیان کرتا ہے۔ یہ اظہار اتنا پُر اثر اور پُر جوش ہے کہ محبوب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پائے گا اور وہ بھی ہمارے حال پر خون کے آنسو روئے گا۔

غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تمھیں اپنے حسن کا واسطہ ہے کہ ذرا اپنے عاشق کی بربادی پر بھی نظر کرلو جس نے اپنی جوانی کو خاک میں ملا دیا اور اب دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہے۔

ادھر منھ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو
مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

محبوب اپنے عاشق کی جان لیتے وقت اس نظارے کی تاب نہ لاکر منھ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔عاشق کو اپنے قتل کیے جانے کا کوئی غم نہیں ہے لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ اس کا محبوب اسے ذبح کرتے وقت منھ نہ پھیرے بلکہ اس وقت تو ایک نگاہ اس پر ڈال لے۔اسی لیے وہ اپنے محبوب سے یہ التجا کرتا ہے کہ ذرا اس طرف رخ کر کے میری گردن پر خنجر کی روانی کا منظر تو دیکھ لو۔

بہارِ زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھوگے
کسی کا عیش مرگ ناگہانی دیکھتے جاؤ

شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ تم نے زندگی کی ہر خوشی پائی ہے اور آئندہ بھی خوشیاں تمھارے قدم چومیں گی۔مگر اس بدنصیب عاشق کا انجام بھی دیکھ لو جس کے حصہ میں مرگِ ناگہانی کے سوا کوئی عیش نہ تھا۔

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کو کل تک عاشق کے شکوے سننے کی تاب نہ تھی۔لو آج اس کی شکوہ گزار زبان بھی خاموش ہوگئی ہے۔ایسے میں اتنی التجا ہے کہ اس کا محبوب اپنے عاشق کی لاش سے کفن سرکا کر اس کی بے زبانی کا منظر ہی دیکھ لے۔

وہ اٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تمھارے عاشق کا جنازہ اٹھایا جارہا ہے۔ تمام دوست واحباب اس مرنے والے کا آخری دیدار کر کے جارہے ہیں۔ ہر طرف سے رونے پیٹنے اور ماتم کی آوازیں تیز ہوتی جارہی ہیں۔ اے محبوب تم بھی آکر یہ دردناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ جاؤ۔

## 9.4 آپ نے کیا سیکھا

1. فانی کا سوانحی خاکہ اور ان کی سماجی زندگی کا پتا چلتا ہے۔
2. فانی کی شاعری کے موضوعات کا اندازہ ہوتا ہے۔
3. فانی کے اسلوب کی خصوصیات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔
4. فانی کی دوغزلوں کی تشریح سامنے آتی ہے۔

## 9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. فانی نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی؟
2. پہلی غزل کے مطلع اور مقطع کی نشان دہی کیجیے۔
3. دوسری غزل کے کسی دو اشعار کی تشریح کیجیے۔
4. فانی کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

## 9.6 فرہنگ

| | | |
|---|---|---|
| ہستی | = | زندگی، حیثیت |
| نیست | = | عدم، فنا |
| ہست | = | زندگی، حیات، وجود |
| عجز | = | کمزوری، انکساری |
| عجز گناہ | = | گناہ کا انکسار، منت |
| عصمتِ پارسائی | = | پاکیزگی، پاکدامنی |
| عصمتِ کامل | = | انتہائی پرہیزگاری، مکمل پاکدامنی |
| وحشت | = | خوف، گھبراہٹ، دیوانگی |
| وحشتِ دل | = | دل کی دیوانگی، جنون |
| سہل | = | آسان |
| کال | = | قحط، کمی، سوکھا |

یادداشتیں

## 9.7 سوالوں کے جواب

1. فانی نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول، بدایوں سے 1817 میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ 1901 میں بریلی سے بی.اے کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی۔ 1906 میں فانی نے اپنے والد کے مشورے پر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں ایل.ایل. بی میں داخلہ لیا۔ 1908 میں ڈگری حاصل کی۔

2. پہلی غزل کا مطلع

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

3. پہلی غزل کا مقطع

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

3. مآلِ سوزِ غمِ ہائے نہانی دیکھتے جاؤ  بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

شاعر کہتا ہے کہ غمِ پنہاں نے رفتہ رفتہ اپنا اثر دِکھایا ہے۔ اب ہمارا انجام نزدیک ہے اور اب زندگی کی شمع بھڑک کر بجھنے والی ہے یعنی ہمارا مرنا بہت نزدیک ہے۔

چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

شاعر کہتا ہے کہ ہم نے تمہاری محبت میں زندگی قربان کردی ہے۔ تم اپنے چاہنے والے کی قبر پر ایک نگاہ تو ڈالتے جاؤ۔ میری قبر دور بھی نہیں ہے بلکہ نزدیک ہے۔ شاعر کے شعر میں میّت اور مدفن کے ذکر کی تکرار کے ایک مخصوص رجحان کی عکاسی ہے۔

4. فانی کا انتقال 27 اگست 1941 کو حیدرآباد میں ہوا اور وہیں دفن بھی ہوئے۔

## 9.8 کتب برائے مطالعہ

1. کلیاتِ فانی — دہلی
2. باقیاتِ فانی — دہلی
3. فانی کی شاعری — ظہیر احمد صدیقی — دہلی
4. علی گڈھ میگزین — ”فانی نمبر“ — 1943

# اکائی نمبر 10 علامہ اقبال کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ

## ساخت


10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 علامہ اقبال کی شاعری

10.3.1 علامہ اقبال کا تعارف

10.3.2 علامہ اقبال کی شعری خصوصیات

10.3.3 علامہ اقبال کی فکر وفن میں انفرادیت

10.3.4 علامہ اقبال کی غزلوں کی تشریحات

(i) کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

(ii) تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ

10.4 آپ نے کیا سیکھا

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

10.6 فرہنگ

10.7 سوالوں کے جوابات

10.8 کتب برائے مطالعہ


## 10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی اور کارنامے سے واقف ہوں گے۔
- علامہ اقبال کے فکر وفن کو سمجھ سکیں گے۔
- علامہ اقبال کی شاعری کے امتیازات جان سکیں گے۔
- علامہ اقبال کی شاعری میں انفرادیت کا تعین کر سکیں گے۔
- علامہ اقبال کی غزل گوئی کی روایت کا جائزہ لے سکیں گے۔
- علامہ اقبال کی دو غزلوں کی تشریح سمجھ سکیں گے۔

## 10.2 تمہید

علامہ اقبال ایک بلند پایہ اور آفاقی حیثیت کے حامل مفکر اور شاعر تھے۔ ہندوستان کے برطانوی عہد میں سیالکوٹ پنجاب (موجودہ پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد کشمیری سپرو برہمن تھے، جو کشمیر سے ہجرت

کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوگئے تھے، ایک دیندار اور مذہبی گھرانے میں اقبال نے آنکھیں کھولیں۔ اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز ہی غزل گوئی سے کیا۔ چونکہ اس وقت داغ دہلوی ہندوستانی اُفقِ شاعری پر چھائے ہوئے تھے اس لیے اقبال نے بھی خط کے ذریعے اصلاح لینا شروع کی۔ مگر چند غزلوں کی ہی اصلاح کے بعد حضرت داغ نے یہ کہہ کر کاملیت کی سند عطا کردی کہ اب اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ اقبال نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تقریباً تین سو غزلیں کہی ہیں اور اُردو شاعری کے چار مجموعۂ کلام ہیں، مگر اقبال کی اصل شناخت اور شہرت، فلسفہ اور نظم نگاری سے ہے۔ انھوں نے خودی، بے خودی، عشقِ حیات اور حرکت و عمل جیسے بہت سے فلسفیانہ نظریات اپنی شاعری اور نثر میں پیش کیئے۔ اسی طرح فنّی سطح پر بھی غزل میں نئے موضوعات، لفظیات، تراکیب، علائم، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا اس مقدار میں اضافہ کیا کہ اُردو شاعری عالمی سطح پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوگئی اور آج بھی بہت سے ممالک میں اقبال کی وجہ سے اُردو شاعری پڑھی اور پسند کی جاتی ہے۔ اقبال نے ابتدائی دَور میں داغ، غالب اور دیگر روایتی شعرا کے رنگ میں شاعری کی، مگر جلد ہی ان کا ذہن مقصدیت کی طرف منتقل ہوگیا اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ امن و آشتی، اتحاد و اتفاق اور قوتِ فکر و عمل کا پیغام دینا شروع کیا۔ ہم اس اِکائی میں علامہ اقبال کے حیات و کارنامے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا مختصر جائزہ اور دو غزلوں کی تشریح پیش کریں گے۔

## 10.3 علامہ اقبال کی شاعری

### 10.3.1 علامہ اقبال کا تعارف

علامہ سر محمد اقبال 9 نومبر 1877 عیسوی بمطابق 30 ذی قعدہ 1294 ہجری کو سیالکوٹ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محلّہ شوالہ کی مسجد میں مولانا غلام حسن کے پاس حاصل کی، اس کے بعد سیّد شاہ میر حسن کے مکتب میں داخلہ لیا جن کے متعلق اقبال نے یہ شعر کہا ہے:

مجھے اقبال اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

مولانا سیّد میر حسن سے اقبال نے اُردو، عربی اور فارسی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اسکاچ مشن ہائی اسکول میں داخلہ لیا جہاں سے 1891 میں مڈل اور 1893 میں میٹرک کا امتحان دیا۔ اس کے بعد 1897 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی.اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا، اسی کالج سے 1899 میں ایم.اے کیا۔ 24 فروری 1900 کو پہلی بار انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں اپنی نظم 'نالہ یتیم' پڑھی۔ 1901 میں رسالہ 'مخزن' میں 'ہمالہ' نظم شائع ہوئی۔ 1899 میں ہی اورینٹل کالج لاہور میں بحیثیت میکلوڈ عربک ریڈر ملازمت شروع کی۔ اس کالج میں 1903 تک ملازم رہے، اس کے بعد 3 جون 1903 سے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تین سال یعنی 1 اکتوبر 1905 تک تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد تین سال کے لیے بلا تنخواہ رخصت لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ اس سفر سے قبل 1903 میں انھوں نے معاشیات کے موضوع پر 'علم الاقتصاد' کے نام سے کتاب لکھی۔ معاشیات کے موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ انگلستان میں انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ 1907 میں جرمنی کے میونخ یونیورسٹی سے 'ایران میں علم مابعد الطبیعات کے ارتقا' کے موضوع پر پی.ایچ.ڈی کی

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

یادداشتیں

ڈگری حاصل کی۔ ایک سال کے بعد ہی 1908 میں کیمبرج یونیورسٹی کے لنکزان سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال 27 جولائی 1908 کو وطن واپس ہوگئے۔ اس کے بعد اٹھارہ ماہ تک بیرسٹری و پروفیسری کے فرائض انجام دیئے۔ 1910 میں حیدر آباد کا سفر کیا۔ 9 نومبر 1914 کو والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا، والدہ کے انتقال کی مناسبت سے اقبال نے 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کے عنوان سے ایک خوبصورت مرثیہ بھی لکھا۔ 1915 میں 'اسرارِ خودی' کی اشاعت ہوئی۔ یکم جنوری 1923 کو حکومت برطانیہ کی طرف سے 'سر' کا خطاب ملا۔ 1926 میں لجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے۔ جنوری 1929 میں مدراس میں اسلامیات کے موضوع پر لکچر دیا، پھر میسور یونیورسٹی اور حیدر آباد میں لکچر دینے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچر دیا (یہ تمام لیکچرس انگریزی زبان میں تھے)۔ 17 اگست 1930 کو والد کا انتقال ہوگیا۔ 29 دسمبر 1930 کو الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسۂ عام کی صدارت کی۔ 7 اکتوبر 1931 کو دوسری گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کی۔ 29 نومبر 1931 کو اٹلی کے مشہور ڈکٹیٹر مسولینی سے ملاقات کی۔ 6 دسمبر 1931 کو فلسطین میں ورلڈ مسلم کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی۔ دسمبر 1932 میں تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے پھر انگلستان کا سفر کیا، اسی سفر میں پروفیسر برگساں سے ملاقات ہوئی اور ہسپانیہ کا سفر کیا۔ 1932 میں نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کا سفر کیا۔ 4 دسمبر 1933 کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے 'ڈی لٹ' کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔ اس کے بعد 23 دسمبر 1934 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے بھی 'ڈی لٹ' کی اعزازی ڈگری تفویض کی گئی۔ الہ آباد یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد نے بھی 1937 میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ 1935 میں بغرض علاج بھوپال کا سفر کیا۔ 1931 میں جامعہ ازہر مصر کے علما سے ملاقات کی۔ یکم جنوری 1938 کو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے تقریر کی۔ جنوری 1938 میں ہی پورے ہندوستان میں یومِ اقبال منایا گیا۔ جنوری 1938 میں پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ملاقات ہوئی۔ بالآخر 21 اپریل 1938 کو علامہ اقبال نے اس دارِ فانی کو الوداع کہا۔ اقبال نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ ان کا پیغام عظمتِ رفتہ کی بازیابی اور کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد ہے۔

### 10.3.2 علامہ اقبال کی شعری خصوصیات

علامہ سر محمد اقبال ایک آفاقی حیثیت کے حامل شاعر تھے۔ ابتدائی عمر سے ہی انھوں نے شاعری شروع کردی تھی، اس وقت ہندوستان میں استاذ شاعر کی حیثیت سے مرزا داغ دہلوی چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے اقبال نے بھی اپنی غزلیں داغ دہلوی کے پاس بغرض اصلاح بھیجنی شروع کیں، مگر جلد ہی داغ دہلوی نے اصلاح کی ضرورت نہ ہونے کا اظہار کردیا، اس کے بعد کسی استاد سے اصلاح نہیں لی۔ اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز ہی غزل گوئی سے کیا تھا۔ ان کے ابتدائی دَور کی شاعری کو پڑھ کر ہی کمال فن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اقبال نے ابتدائی دور میں میر، غالب، داغ اور دیگر کلاسیکی شعرا کے انداز میں غزلیں کہیں اور مناظرِ قدرت اور حسن و عشق کے موضوعات کو غزل کا حصہ بنایا، مگر جوں جوں ان کی نگاہ آفاقی ہوتی چلی گئی، ان کی غزلیں بھی روایتی حدود سے نکلتی گئیں اور انھوں نے سماجی، سیاسی، معاشی، مذہبی، وطنی، قومی اور اسلامی موضوعات کو بھی

یادداشتیں

غزل کا حصہ بنانا شروع کیا، جس کی وجہ سے اُردو غزل کا دائرہ کافی وسیع ہوا۔ زمانہ کے حساب سے اقبال کا نقطۂ نظر بدلتا رہا۔ یہی اثرات ان کی جملہ شاعری پر بھی پڑے۔ 'بانگ درا' میں تین طرح کی غزلیں ہیں اور 'بالِ جبریل' جسے اقبال کی شاعری کی معراج سے تعبیر کیا جاتا ہے میں انتہائی اعلیٰ درجہ کی غزل گوئی کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ غزل کی دنیا سے نکل کر نظم کی طرف ساری توجہ مبذول ہونے لگی اور پیام رسانی اور ملت کی بیداری ہی ان کا اصل محور بن گیا۔ اقبال کا کمال ہے کہ انھوں نے نظم کی طرح غزل کو بھی تشکیل وتعمیر کے لیے استعمال کیا ہے اور خارجیت سے داخلیت کا سفر بڑی خوبصورتی سے طے کرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو غزل گوئی کے باب میں اقبال کا وہی مقام ہے جو فارسی میں سعدی اور حافظ کا ہے۔

داغ کے رنگ کی غزل:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

غالب کا رنگ:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

## نظم نگاری

علامہ اقبال نے اگرچہ شاعری کی ابتدا روایتی انداز میں غزل گوئی سے کی تھی، مگر ان کا ذہن مفکرانہ اور فلسفیانہ تھا اور مکمل طور پر ان کے دل و دماغ نے اس روایت کو فروغ دینے کا تہیہ کرلیا تھا جسے سرسیّد اور حالی نے قائم کیا تھا، اور ابتدائی دَور سے ہی ایسی شاہکار نظمیں لکھنا شروع کردی تھیں کہ فکر وفن دونوں اعتبار سے ان نظموں کی نظیر نہیں ملتی۔ اقبال کے اُردو کے چار مجموعہ کلام ہیں جو 'بانگِ درا'، 'بالِ جبریل'، 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' کے نام سے موسوم ہیں۔ 'بانگ درا' کی نظموں میں حسنِ فطرت سے دلچسپی اور حب الوطنی کے جذبات زیادہ نمایاں ہیں۔ 'بالِ جبریل' میں مفکرانہ پہلو غالب ہے اور 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' کی نظموں میں قوم وملت کے درد کے ساتھ ساتھ ڈرامائی اور خطابتی انداز بھی خوب دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنی نظموں میں ہندوستان دوستی اور حب الوطنی کی جو مثالیں پیش کی ہیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ مناظرِ فطرت اور بچوں کے متعلق بھی شاندار نظمیں لکھی ہیں اور اس باب میں وہ ایمرسن، کاوپر، لانگ فیلو، ٹینی سن، ورڈس ورتھ اور شیلی وغیرہ مغربی شعرا سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ حب الوطنی، انگریزی خیالات، فارسی بندشیں، وطن پرستی، مصوری اور منظر کشی کے نمونوں کو ہمالہ، گل رنگیں، ابر کہسار، آفتابِ صبح، گلِ پژمردہ، ماہِ نو، موجِ دریا، چاند، جگنو، صبح کا ستارہ، کنارِ راوی، صدائے درد، تصویرِ درد، ترانۂ ہندی اور نیا شوالہ وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے، بطورِ مثال ہمالہ کا ایک اقتباس:

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

غرض خواہ اقبال کی غزل گوئی کا جائزہ لیں یا نظم نگاری کا، دونوں باب میں ان کی انفرادیت مسلّم ہے۔ انھوں نے چاروں مجموعوں میں بڑی تعداد میں خوبصورت غزلیں اور نظمیں شامل کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اُردو شاعری کی دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی اصل شناخت نظم اور غزل کے باب میں ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے فارسی میں بھی شاعری کی اور 'اسرارِ خودی'، 'رموزِ بےخودی'، 'جاوید نامہ'، 'پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'، 'سفر نامہ اور فلسفۂ عجم' جیسی شاہکار کتابیں پیش کر کے فارسی شاعری میں مہارت کا ثبوت پیش کیا۔

### 10.3.3 علامہ اقبال کی فکر وفن میں انفرادیت

اقبال کی شناخت فکر اور فن دونوں اعتبار سے ہے۔ اقبال نے جہاں شاعری میں آفاقی افکار اور فلسفیانہ خیالات پیش کیئے اور خودی، بےخودی، حرکت وعمل شعورِ ذات، حیات وکائنات، عشق جیسے بہت سے منفرد فلسفے پیش کیئے وہیں فنّی سطح پر بھی شاعری کو جلا بخشنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہی وجہ ہے کہ فنّی سطح پر بھی ان کی شاعری ایک معراج ہے۔ اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے افکار اور فکری سرچشموں کو سمجھنا بےحد ضروری ہے۔ قرآن اور حدیث کے علاوہ اقبال کی فکر کے تین سرچشمے ہیں:

1. مسلمان حکما اور صوفیا جن میں شیخ احمد سرہندی فاروقی مجدد الف ثانی اور جلال الدین رومی وغیرہ شامل ہیں۔
2. دوسرا سرچشمہ مغربی مفکرین کا ہے، جن میں گوئٹے، دانتے، نطشے، برگساں اور دیگر شعرا وحکما شامل ہیں۔
3. تیسرے سرچشمے میں قدیم ہندو مفکرین وشعرا کو شامل کیا جاتا ہے، جن میں اہم نام بھرتری ہری، کالیداس اور رام وغیرہ کا ہے، بلکہ اقبال نے 'بالِ جبریل' جیسی معرکۃ الآرا تصنیف کا عنوان بھرتری ہری کے فلسفے سے ہی ماخوذ کی ہے:

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اقبال نے حب الوطنی کے متعلق جو اشعار کہے ہیں ان میں اس قدر غنائیت، سلاست، روانی اور تخیل کی پروازی ملتی ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

## فن

فنّی اعتبار سے اگر ہم اقبال کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال فنِ شعر وادب کے بارے میں مخصوص خیالات رکھتے تھے وہ ایک بڑے فنکار تھے اور تقریباً تمام ہی اصنافِ سخن میں انھوں نے طبع آزمائی بھی کی۔ ان کی شاعری کہیں تاثراتی ہے تو کہیں فلسفیانہ، مکالماتی اور بیانیہ ان سے پہلے روایتی علائم، تشبیہات اور استعارات کو ہی شاعری کا حصہ بنایا جاتا تھا، مگر اقبال نے نئے نئے علائم، لفظیات، تشبیہات واستعارات، عمدہ

یادداشتیں

تراکیب، اصطلاحات، پیکر تراشی اور منظر کشی کے عمدہ نمونوں کو شاعری میں شامل کر کے نہ صرف یہ کہ اپنی شاعری کو آفاقی حیثیت کا حامل بنایا، بلکہ اُردو شاعری کا دائرہ بھی کافی وسیع کیا:

**موسیقیت**

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

**تشبیہ**

آدمی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

**تراکیب**

اقبال کو تراکیب استعمال کرنے میں بھی یدِطولیٰ حاصل ہے۔ انھوں نے دولفظی، اور سہ لفظی تراکیب کو اس خوبصورتی سے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے کہ سلاست، روانی، اثر آفرینی اور غنائیت میں فرق نہیں آتا ہے:

کہیں اس عالمِ رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانہ دنبالۂ محمل نہ بن جائے
سوالِ مے نہ کروں ساقیٔ فرنگ سے میں
کہ یہ طریقۂ رندانِ پاک باز نہیں

**زور بیان**

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمّت مردانہ

**رمز و ایما**

وہ شب درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں

**سوز و گداز**

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

**پیکر تراشی**

پانی کو چھو رہی ہے یوں جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

اس کے علاوہ پیکر تراشی، سراپا نگاری، نیچرل، امیجری، تمثال، محاکات نگاری، صنعت نگاری وغیرہ کے بھی بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال فکر و فن دونوں اعتبار سے بے مثال شاعر ہیں۔

## 10.3.4 علامہ اقبال کی غزلوں کی تشریحات

### غزل 1

کبھی اے حقیقتِ منتظَر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہوتو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دم طواف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زُلف ایاز میں

میں جو سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

### تشریح

علامہ اقبال کی یہ غزل 'بانگِ درا' کی سب سے مشہور غزل مانی جاتی ہے۔ بحر کامل مثمن سالم ہے، متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن اس کا وزن ہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظَر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ شعر رمز و ایمائیت کی اعلیٰ مثال ہے، اس شعر کی مختلف تشریح ہوسکتی ہے۔ ایک توضیح تو یہ ہوسکتی ہے کہ اس شعر میں اقبال بخاری کی حدیث مراد لے رہے ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی اس طرح عبادت کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم یہ تو ہو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ حقیقتِ منتظر میں 'ظ' پر زبر ہے، یعنی وہ حقیقت جس کا انتظار کیا جائے یعنی اللہ تعالیٰ مراد ہے۔ اقبال خدا کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ تو لباسِ مجاز یعنی ظاہری شکل وصورت میں نظر آ۔ میری پیشانی بے تاب ہے ہزاروں سجدہ کرنے کے لیے۔ اس شعر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے دیدار کی خواہش ظاہر کی تو جواب ملا نہیں کر سکتے مگر آخری نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو معراج میں بلا کر اپنے دیدار کا موقع عنایت

یادداشتیں

فرمایا۔ اس شعر کے مفہوم کو کسی شاعر نے اس انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے:

تو سامنے آ میں سجدہ کروں    پھر لطف ہے سجدہ کرنے کا
تو اور کہیں میں اور کہیں    تیرے نام کو سجدہ کون کرے

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں

یہ شعر بھی پہلے شعر کی توسیع ہے، پہلے مصرعے میں لباسِ مجاز استعمال کیا تھا، اب مزید استعارے استعمال کررہے ہیں یا بہ الفاظ دیگر کہ لباسِ مجاز میں ظاہر ہونے کے دلائل پیش کررہے ہیں۔ طرب آشنائے خروش یعنی شور وغل اور ہنگامہ خیزی سے خوشی حاصل کرنے والا اور نوا ہے محرم گوش یعنی ہمرازِ گفتگو یعنی اے رب تو اپنی خوش وخرم آواز سنا، گفتگو کر ورنہ اس نغمہ میں کیا مزہ جو سکوت کے پردہ میں چھپا ہوا ہو یعنی آواز ہی نہ آئے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اس شعر میں اقبال خدا کے بجائے اپنے اور قاری کی طرف متوجہ ہیں کہ اپنے دل کو بچانے کی فکر مت کرو، یہاں آئینہ استعارہ ہے دل کا، دل ٹوٹ جائے تب خدا کو اور زیادہ پسند ہے، ممکن ہے اقبال کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہو جہاں نفس کو مارنے اور قابو پانے کی بات کہی گئی ہے۔ اسی مفہوم کو اقبال نے دوسری جگہ اس طرح شعری جامہ پہنایا ہے:

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مئے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

اقبال کا فلسفہ مستقل جدوجہد ہے۔ سعی وعمل سے دشواریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ مصائب، آلام، پریشانیوں اور مشکلات سے زندگی مضبوط ہوتی ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

دمِ طواف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیثِ گداز میں

یہ شعر ڈرامائیت سے پُر ہے۔ اقبال نے شمع اور پروانے کا مکالمہ کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے، شمع کے اِرد گرد گھومتے پتنگے سے شمع نے کہا کہ اب پہلی سی بات نہ تو تیرے جلنے اور طواف کرنے میں ہے اور نہ میرے پگھلنے میں۔ یہاں شمع اور پروانہ استعارہ ہے اثر کہن پرانی تاثیر کو کہتے ہیں، حکایت سوز، جلنے کی کہانی اور حدیثِ گداز پگھلنے کی بات، یہاں مخاطب قاری اور خاص طور پر مسلم قوم ہے کہ اب ان میں وہ قوتِ فکر وعمل نہیں جو پہلے تھی، مقصد کے حصول کے لیے فنا قبول کرنے کو تیار رہتے تھے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

'اماں' پناہ کو کہتے ہیں۔ اقبال اس شعر میں بیان کر رہے ہیں کہ گناہ کرنے کے بعد مجھے کوئی ایسا مقام نہیں ملا جہاں پناہ مل سکے، جیسے خطا کار اور گنہگار کو صرف تیری صفتِ عفو اور رحمت میں ہی پناہ ملی، یعنی تو اپنی صفتِ رحیم کی وجہ سے گناہوں سے توبہ کی توفیق دے دیتا ہے اور مجھ جیسا مجرم بہ آسانی امان پا لیتا ہے۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زُلف ایاز میں

یہ شعر بھی پہلے شعر کے مفہوم کی توسیع ہے، محمود اور ایاز کے استعارے کے ذریعے قوم کی بے یقینی اور بے عملی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی اب عاشق اور معشوق دونوں اپنی صفات کھو چکے ہیں یعنی رعایا اور حاکم دونوں کی کیفیت ایک سی ہوگئی ہے۔ نہ غزنوی جیسا عاشق ہے اور نہ ہی ایاز جیسے خمدار زُلف ہیں جن پر عاشق ہوا جائے۔

میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اس شعر کا مفہوم الفاظ سے ہی واضح ہے۔ اقبال کہہ رہے ہیں کہ یکسوئی اور دل لگی سے آج ہم ایک بھی سجدہ نہیں کر پاتے، بلکہ عبارت میں بھی ہم کھوئے رہتے ہیں، تو جب ہم خدا سے دل سے مانگ ہی نہیں رہے ہیں تو وہ دے گا کیسے؟ اور ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جیسے میں سجدہ میں جاتا ہوں فوراً خیالات آنے لگتے ہیں کہ تو تو گنہگار ہے، تجھے کیا فائدہ نماز پڑھ کے حالانکہ ایسا نہیں ہے، ثواب تو ملے گا ہی۔ ایک شعر میں ارشاد فرمایا:

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اس کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

ایک رباعی میں علامہ کہتے ہیں:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

## غزل 2

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت وہ نگہ کا تازیانہ

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ ، نہ تراشِ آزرانہ

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے، نہ قفس، نہ آشیانہ

رگِ تاک منتظر ہے، تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے مے کدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

مرے خاک وخوں سے تونے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

## تشریح

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت وہ نگہ کا تازیانہ

یہ غزل تغزل کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، عشق کی پہلی منزل ادب ہے۔ اسی عشقیہ رنگ میں ڈوب کر اقبال نے یہ غزل لکھی ہے۔ اقبال محبوب سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ کیا تجھے میرے ادب و احترام کا زمانہ یاد نہیں۔ یہ ابتدائے عشق کی گفتگو ہے، اس زمانہ میں عاشق بالکل گستاخی نہیں کرتا، اس نقشہ کو اقبال کھینچ رہے ہیں کہ میں سچا عشق ہوں، میں نے عشق کے تمام لوازمات کو پورا کیا ہے، اس لیے تیرے جمال سے لطف اندوز ہونے کی مجھے اجازت ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے صرف دو لفظوں میں عہدِ گذشتہ کی تصویر کھینچ کر مصوری کا بہت ہی عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ بلاغت کی بھی عمدہ مثال ہے یہ شعر:

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ ، نہ تراشِ آزرانہ

اس شعر میں اقبال کے مخاطب کالج اور عصری اداروں میں پڑھنے والے نوجوان طلبہ و طالبات ہیں، ان کے متعلق استعاراتی انداز میں افسوس کا اظہار کررہے ہیں کہ ان کی زندگیاں بالکل برباد ہوگئی ہیں، بالفاظ دیگر اس شعر کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ:

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

یعنی عصری علوم حاصل کرنے والے عہدِ حاضر کے علوم میں بھی پختہ اور بے مثال نہیں ہیں۔ حقیقی علوم کو چھوڑ کر انھوں نے کفر اختیار کیا لیکن افسوس کہ وہ اس میں بھی نامکمل اور کچّے ہیں۔ اقبال چاہتے ہیں کہ جو بھی علم حاصل کیا جائے وہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہوا ہونا چاہیے۔

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے نہ قفس نہ آشیانہ

اقبال ایک فلسفی کی حیثیت سے اس شعر میں دنیا کی حقیقت بیان کررہے ہیں کہ انسان کے لیے اس دنیا میں کوئی وقت خالی نہیں ہے، بلکہ ہر وقت مشغول ومنہمک رہنے کا ہے۔ یہ دنیا نہ تو پنجرہ اور قید خانہ ہے کہ انسان بالکل مجبور محض ہو اور کچھ بھی اپنی مرضی سے نہ کرسکتا ہو اور نہ ہی آشیانہ ہے کہ انسان سکون واطمینان سے رہے بلکہ دنیا غم اور خوشی کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ انسان نہ مکمل طور پر مختار ہے اور نہ مکمل طور پر مجبورِ محض ہے۔

رگ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے مے کدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

یہ شعر شکوہ اور دعا پر مشتمل ہے۔ اس شعر میں اقبال خدا سے درخواست کررہے ہیں کہ انگور کی خشک بیلیں تیرے کرم کی بارش کا انتظار کررہی ہے کہ بارش ہو اور پھر سے ہری بھری اور بارآور ہوجائیں۔ تازہ رسیلے انگور پیدا ہوں جن سے شرابِ معرفت کشید کی جاسکے۔ میکدوں سے خانقاہیں اور دانش گاہیں مراد ہیں کہ میکدے تو موجود ہیں، لیکن اس میں وہ شراب نہیں ہے، جس کی ضرورت ہے۔ یعنی علم کی شراب، معرفت کی شراب۔ خدا تو اپنے فضل و کرم سے ایسی کرم کی بارش برسا کہ جس سے عجم کے خالی میکدے پھر آباد ہوجائیں اور پھر وہی نشہ چڑھ جائے جو پہلے کے زمانے میں صحابہ کرام کی طرح تھا۔

مرے ہم صفیر اسے بھی اثر بہار سمجھے
انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

شاعری جذبۂ عشق کی پیداوار ہوتی ہے، خواہ مجازی ہو یا حقیقی۔ اقبال نے ہم صفیر کے ذریعے اس شعر میں اپنے ہم عصر شعرا اور دانشور حضرات کو مراد لیا ہے کہ میرے ہم عصر حضرات میری شاعری کو موسمِ بہار کی پیداوار اور عشق مجازی کا نتیجہ نہ سمجھیں، انھیں کیا خبر کہ میری شاعری کی کیا اساس ہے؟ میری شاعری تو مقصدی شاعری ہے۔ مجھے گل وبلبل اور شمع و پروانہ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمندوں کا طرزِ کلام اور ہے
مرے خاک وخوں سے تونے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے، تب و تاب جاودانہ

اقبال خدا سے مخاطب ہیں کہ یہ کائنات انسان کے جذبۂ عشق کی مظہر ہے۔ تونے انسانوں کو پیدا کیا اور اسے اعلیٰ صلاحیتوں اور کمالات سے بھی نوازا اور اس نے بھی تیرے لیے قربانیاں دیں۔ ان کی محنتوں کے طفیل میں انھیں بھی حیاتِ دوام اور انھیں تب وتابِ جاودانہ عطا فرما۔ اس شعر میں ساتھ ساتھ شکوہ بھی ہے کہ انسانوں نے تیرا نام زندہ رکھنے کے لیے بہت سی قربانیاں دیں تبھی تیرا نام زندہ ہے۔ اس کا صلہ تو ملنا ہی چاہیے۔

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایت زمانہ

اس شعر میں اقبال نے اپنے رب کے رحیمی و کریمی کا اعتراف کیا ہے کہ تیری بندہ پروری کے ہی طفیل میں میرے دن اچھی طرح سے گزر رہے ہیں، اور اس طرح عزت سے میری زندگی بسر ہو رہی ہے کہ نہ دوستوں سے شکایت ہے اور نہ ہی زمانہ سے البتہ غور کیا جائے تو اس شعر میں دوستوں کی کج ادائی اور بے وفائی کا شکوہ پوشیدہ ہے۔

## 10.4 آپ نے کیا سیکھا

1. اقبال کے سوانحی خاکہ اور تعلیمی زندگی کا علم ہوتا ہے۔
2. اقبال کی شاعری کی خصوصیات سے واقفیت ہوتی ہے۔
3. اقبال کے فکر وفن میں گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔
4. اقبال کی دو غزلوں کی تشریح سامنے آتی ہے۔
5. اقبال کے شاعری میں مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔

## 10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. اقبال کا پورا نام، تاریخِ پیدائش اور وفات بیان کیجیے؟
2. اقبال کی شاعری کی خصوصیات مختصر بیان کیجیے۔
3. پہلی غزل کی بحر متعین کیجیے۔
4. اقبال نے شاعری کی ابتدا کس صنف سے کی اور کس رنگ میں؟
5. پہلی اور دوسری غزل کے ایک ایک شعر کی تشریح کیجیے۔

## 10.6 فرہنگ

| | | |
|---|---|---|
| حقیقتِ منتظر | = | وہ حقیقت جس کا انتظار کیا جائے یعنی اللہ تعالیٰ ظاہری شکل میں۔ |
| لباسِ مجاز | = | یعنی مادّیت سے متصف جسم یعنی صاف نظر آنے والی چیز۔ |
| جبیں: | = | پیشانی |
| طرب آشنا | = | خوشی سے واقف ہونا۔ |
| خروش | = | لغوی معنی شور و غل، یہاں خاموشی کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ |
| محرم گوش | = | کانوں کا ہمراز، کانوں کو سمجھ آنے والا، بات کرنے والا۔ |
| سرود | = | نغمہ |
| سکوت | = | خاموشی |

شکستہ = ٹوٹا ہوا

طواف = دائرے میں گھومنا، چکر لگانا

کرمک = پروانا، پتنگا

اثر کہن = پرانی تاثیر (پہلی سی بات)

حکایت سوز = جلنے کی کہانی، فنا ہونے کی لگن

حدیث گداز = پگھلنے کی بات، پگھلنے کا عمل

اماں = پناہ

خانہ خراب = ویران گھر، یہاں مراد گنہگار انسان

عفو = پناہ

صدا = آواز

صنم = بت

تازیانہ = تیزی، چالاکی، کوڑا جس سے تنبیہ کی جائے

مے کدہ = شراب خانہ

رگِ تاک = انگور کی بیل

مغانہ = رندو مستی والا، شراب والا

صفیر = چہچہانے کی آواز، دلکش آواز، ہم صفیر سے مراد ہم عصر لوگ

خاک = مٹّی

صلہ = بدلہ

تب وتاب = چمک دمک

جاودانہ = ہمیشہ

گلہ = شکایت

## 10.7 سوالوں کے جوابات

1. اقبال کا پورا نام محمد اقبال ہے۔ علامہ اور سر خطابات ہیں۔ 9 نومبر 1877 عیسوی کو سیالکوٹ پنجاب میں پیدا ہوئے اور 21 اپریل 1938 عیسوی کو انتقال ہوا۔

2. اقبال کی شاعری بہت سی خصوصیات سے مزین ہے۔ انھوں نے جہاں شاعری میں بہت سے نئی لفظیات وعلائم، تراکیب وتشبیہات واستعارات، تلمیحات، محاکات، منظر نگاری اور پیکر تراشی وغیرہ کے نمونے پیش کیئے وہیں شاعری کو گل وبلبل اور گیسو ورخسار سے نکال کر خودی، بے خودی، عشق، حرکت وعمل، شعورِ ذات اور حیات وکائنات کے بہت سے فلسفے پیش کیئے۔ شاعری کو دنیا کے زندہ اور تاریخی حوالوں سے مزّین کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں صفت نگاری کے بھی نمونے اس قدر ملتے ہیں کہ دیگر شعرا

کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے تقریباً تمام ہی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، مگر ان کی زیادہ شہرت غزل اور نظم کے باب میں ہے۔ ان کے اُردو کے چار مجموعے ہیں: (1) بانگِ درا، (2) بالِ جبریل (3) ضربِ کلیم (4) ارمغانِ حجاز۔

3. اقبال کی یہ غزل بحر کامل مثمن سالم میں ہے۔
متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن

4. اقبال نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی، چونکہ اس وقت داغ دہلوی استاد شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور تھے، اس لیے ان سے شاعری میں اصلاح بھی لی اور ابتدائی دور میں روایتی انداز کی شاعری، داغ، میر، غالب اور دیگر کلاسیکی شعرا کے رنگ میں کی:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ان کے ابتدائی دور کی غزل کا نمونہ ہے۔

5. تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اقبال نے اس شعر میں قاری کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ اپنے دِلوں کو ٹوٹنے سے مت بچاؤ بلکہ ٹوٹنے کے بعد اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے اور خدا کے نزدیک شکستہ دل انسان اور زیادہ قربت حاصل کر لیتا ہے:

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے، نہ قفس، نہ آشیانہ

اس شعر میں اقبال نے انسان کو مخاطب کر کے ایک فلسفی کی حیثیت سے دنیا کی حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اس دنیا میں انسان کے لیے کوئی بھی لمحہ خالی نہیں ہے، بلکہ وہ ہر وقت مشغول رہتا ہے، نہ وہ قفس میں ہے کہ مجبورِ محض ہو کر کچھ کر نہ سکے اور نہ آشیانہ میں ہے کہ سکون و اطمینان کی سانس لے سکے، بلکہ دنیا خوشی و غم کے حسین امتزاج کا نام ہے۔

## 10.8 کتب برائے مطالعہ

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1. | ذکرِ اقبال | = | عبدالمجید سالک |
| 2. | اقبال سب کے لیے | = | ڈاکٹر فرمان فتح پوری |
| 3. | شرح کلیات اقبال | = | پروفیسر یوسف سلیم چشتی |
| 4. | اقبال کامل | = | ڈاکٹر عبدالسلام ندوی |
| 5. | روحِ اقبال | = | یوسف حسین خاں |
| 6. | کلیاتِ اقبال اُردو | = | علامہ اقبال |

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

# اکائی نمبر 11 فراق گورکھپوری کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ

## ساخت


11.1 اغراض و مقاصد

11.2 تمہید

11.3 فراق گورکھپوری کی شاعری

11.3.1 فراق گورکھپوری کا تعارف

11.3.2 فراق گورکھپوری کی شعری خصوصیات

11.3.3 فراق گورکھپوری کی غزلوں کی تشریحات

(i) بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں

(ii) سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں

11.4 آپ نے کیا سیکھا

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

11.6 فرہنگ

11.7 سوالات کے جوابات

11.8 کتب برائے مطالعہ


## 11.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

- فراق گورکھپوری کے حالاتِ زندگی اور کارنامے سے واقف ہوں گے۔
- فراق گورکھپوری کے فکر وفن کو سمجھ سکیں گے۔
- فراق گورکھپوری کی شاعری کے امتیازات جان سکیں گے۔
- فراق گورکھپوری کی شاعری میں انفرادیت کا تعین کر سکیں گے۔
- فراق گورکھپوری کی غزل گوئی کی روایت کا جائزہ لے سکیں گے۔
- فراق گورکھپوری کی دو غزلوں کی تشریح سمجھ سکیں گے۔

## 11.2 تمہید

اردو شاعری کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس دوران سیکڑوں شاعر پیدا ہوئے۔ مختلف اصناف میں طبع

آزمائی کی۔ کلام اور اسلوب کی چھاپ چھوڑی اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اُردو شاعری کی قدر و قیمت میں اضافے کیئے۔ قدیم شعرا میں قلی قطب شاہ، ولی گجراتی، میر، نظیر، انیس، غالب اور اقبال وغیرہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو شاعری میں کارہائے نمایاں انجام دیئے بلکہ اپنے اپنے عہد میں فکر و فن سے اردو ادب کو متاثر کیا۔ عہد حاضر کے شعرا میں بھی چند ایسے شاعر ہیں جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اسی میں سے ایک شاعر فراق گورکھپوری ہیں۔

## 11.3 فراق گورکھپوری کی شاعری

### 11.3.1 فراق گورکھپوری کا تعارف

فراق 28 اگست 1896 کو شہر گورکھپور میں ایک کائستھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت شہر گورکھپور کے ایک ممتاز وکیل تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ فراق کی ابتدائی تعلیم و تربیت خاندانی روایات کے مطابق اردو فارسی کے ذریعہ ہوئی۔ فراق کا پورا نام رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ہے۔ فراق اپنے بچپن میں والدین سے تلسی داس کی رامائن کا پاٹھ بھی سنتے تھے، انھیں بہت لطف آتا تھا۔ فراق جیسے جیسے بلوغت کی طرف بڑھتے گئے، ان کے اندر شائستگی بھی بڑھنے لگی۔ انھوں نے اردو فارسی کے ساتھ ہندی زبان و ادب سے بھی واقفیت حاصل کی۔ وہ ایک متمول اور آسودہ حال خاندان میں پیدا ہوئے جہاں انھیں ہر طرح کی سہولتیں اور عیش و آرام میسر تھا۔ باقاعدہ تعلیم کی ابتدا ایک ماڈل اسکول سے ہوئی جو ان کے گھر سے قریب تھا۔ بعد میں مشن اسکول اور گورنمنٹ جبلی اسکول میں تعلیم حاصل کی پھر گورکھپور کو چھوڑ کر الہ آباد گئے اور وہاں سینٹرل کالج میں داخلہ لیا۔ پڑھائی میں وہ بہت دلچسپی لیتے تھے اور ہمیشہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتے تھے۔ 1914 میں ان کی شادی ہوئی۔ لیکن شادی شدہ زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسی زمانے میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی غیر معمولی قابلیت اور صلاحیت ان کے کام آئی اور وہ PCS کے امتحان میں بھی کامیاب ہوگئے 1919 میں وہ ڈپٹی کلکٹر نامزد ہوگئے۔ انٹرویو کے بعد ICS کے لیے بھی چُن لیئے گئے۔ لیکن اس وقت تک فراق گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون سے متعارف ہو چکے تھے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کی ماتحتی میں ملازمت کرنے کا فیصلہ ترک کردیا جس پر انھیں کافی سراہا گیا اور ان کا جشن بھی منایا گیا۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فراق ICS کے منتخب نہیں ہوئے تھے۔ فراق کو انگریز حکومت نے جیل میں بھی ڈالا۔ 1927 میں وہ لکھنؤ کرسچین کالج میں لیکچرر ہوئے۔ اسی درمیان آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں لیکچرر ہوگئے۔ اور 1958 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ تین اولادیں ہوئیں ایک لڑکا دو لڑکیاں لڑکے نے خودکشی کرلی۔ ان کی ادبی خدمات کے نتیجے میں ہماری سرکار نے انھیں ''پدم بھوشن'' سے نوازا۔ انھیں ملک کا سب سے بڑا انعام گیان پیٹھ بھی ملا۔ ساہتیہ اکیڈمی انعام اور نہرو انعام بھی ملا۔ 1983 میں دہلی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

## فراق کا عہد، سیاسی، سماجی ادبی ماحول

فراق کی زندگی کا بڑا عرصہ انگریز حکومت کے تحت گزرا یہ وہی زمانہ ہے جب گاندھی جی اور پنڈت نہرو انگریزی اقتدار کے خلاف تحریک چلا رہے تھے، کانگریس پارٹی انگریزی اقتدار کے خاتمے کے لیے بے حد سرگرم تھی، ملک کا سماجی ڈھانچہ بہت بگڑا ہوا تھا۔ غربت، مفلسی، جہالت اور بیماری کا دور دورہ تھا۔ ملک میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت، حسد اور دشمنی اپنے عروج پر تھی۔ مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔ یہ وہی دور ہے جب اردو کے بعض اہم شعرا اور ادبا بھی انگریزی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے تھے۔ مثلاً اکبرالہ آبادی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، مہاراجہ کشن پرشاد، مولانا ظفرعلی خاں، منشی پریم چند، آغا حشر کاشمیری، سیماب اکبرآبادی، برج نرائن چکبست، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، جگر مرادآبادی، فیض احمد فیض، فانی بدایونی، مخدوم اور مجروح وغیرہ۔ فراق ان خوش قسمت شاعروں اور ادیبوں میں تھے جنھیں آزاد ہندوستان نہ صرف دیکھنے کو ملا بلکہ اس کی برکتوں سے بھی مستفید ہوئے، شاعر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے پورے ملک کے چپے چپے میں مشاعروں میں شرکت کی اور اردو زبان و ادب کو فائدہ پہنچایا۔ مشاعرے اس دور میں کافی حد تک معیاری ہوتے تھے۔ لوگ اچھے اشعار کی داد دیتے تھے۔ یہ ایک پلیٹ فارم تھا جہاں ملکی سیاست، سماجی زندگی اور معاشرت میں خرابیوں اور کمیوں کی طرف خوب اشارے ہوتے تھے۔ اس طرح اصلاح اور ترقی کے لیے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ فراق گورکھپوری مشاعروں کے بہت مشہور شاعر تھے بلکہ ان کے بغیر کسی مشاعرے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کی طبیعت میں اعلا درجے کا حسِ مزاح تھا جس کا اظہار اکثر مشاعروں میں بھی ہوتا تھا جس کی انھیں بہت داد ملتی تھی۔

## شاعری کا ارتقا

فراق جدید دور کے بے حد ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے گرچہ غزل سے شاعری کی ابتدا کی اور اپنی غزلوں کے سبب ہی مقبولیت اور شہرت کی بلندی تک پہنچے لیکن انھوں نے نظمیں بھی لکھیں اور رباعیات بھی کہیں جن کی ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ فراق نے جس ادبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ فضا حسرت، اصغر اور جگر کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ:

> ”لکھنؤ اسکول کا مجھ پر کوئی اثر نہیں تھا دوم یہ کہ میں امیر مینائی کے پیدا کیے ہوئے اثرات کی منزلوں کو اب خیرباد کہہ رہا تھا۔۔ اپنی غزل گوئی کی راہ تلاش کر رہا تھا اور اپنی آواز ڈھونڈ رہا تھا۔“

فراق کی غزل گوئی مختلف شعرا سے متاثر رہی ہے اور ان کے یہاں روایتی موضوعات کم نہیں ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فراق ان روایتوں کے اسیر ہو کر نہیں رہے۔ انھوں نے اردو کے کلاسیکی شعرا کا مطالعہ کیا تھا۔ ہندی اور سنسکرت کی شعری روایت سے واقف تھے علاوہ ازیں وہ چونکہ انگریزی کے استاد تھے اس لیے تینوں روایتوں اور سرچشموں سے انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بہت جلد اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی زندگی اور اس کے گوناگوں مظاہر سے انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے بیک وقت فارسی اور اردو کی ادبی لسانی روایت سے استفادہ کرنے کے لیے ان تمام شعرا سے رجوع کیا جنھوں نے ادبی تاریخ پر اپنی ذہانت اور تخلیقی اپج کا گہرا نقش چھوڑا تھا مثلاً میر، مصحفی، نظیر، انیس، غالب، اقبال، فیض اور فانی وغیرہ۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی غزلوں میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ اس مغربی اور مقبول عام ہندی کو جس کا نام اردو زبان و ادب ہے زیادہ سے زیادہ اور اس میں گنگ وجمن کے دوآبے کی شادابی اور انسانی تہذیب کے اس حسن کو سمودوں تاکہ میری غزلوں میں سطحیت، کڑاپن خیر و برکت کے عناصر سے محرومی اور دوسرے بیمار عناصر جگہ نہ پانے پائیں اور میری غزلوں میں تہذیب ہند اور تہذیب عالم کا حقیقی ترنم گونجے۔۔۔ میں نے چاہا ہے کہ میری شاعری اس دھرتی کی شاعری رہے یعنی اس میں وہ دھرتی بولتی ہوئی اور رقص کرتی ہوئی سنائی اور دکھائی دے جو کروڑوں سال پرانی ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ اپنے آپ کو نیا کرتی رہتی ہے۔ وہ دھرتی جو سدا سہاگ اور سدا بہار ہے۔''

## اصناف اور موضوعات

فراق نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں، کچھ نظمیں بھی ہیں اور رباعیات پر مشتمل ایک مجموعہ روپ (سنگار رس کی رباعیاں)، شائع ہو چکا ہے۔ ان کے موضوعات میں عشق اور جنس کو اولیت حاصل ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے کسی اور موضوع کو ہاتھ نہ لگایا ہو۔ شاعر چونکہ تفصیل سے کسی خیال، تصور، فلسفے یا نظریے کی ترسیل وتبلیغ کر سکتا۔ چنانچہ وہ زندگی کے جس قدر بھی وسیع وعریض موضوعات کو اپنی شاعری میں داخل کرے گا۔ اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں لیکن ان موضوعات کے ساتھ اس کا برتاؤ شاعرانہ ہونا چاہیے۔ اسی پابندی میں رہتے ہوئے فراق نے زندگی کے ہزاروں مسائل کو اپنی شاعرانہ فکر کا محور بنایا ہے لیکن ان کو اشاروں کنایوں، یعنی استعاروں کے پردے میں ہی بیان کیا ہے۔ اب یہ کام قاری کا ہے کہ وہ اپنی محنت اور صلاحیت سے ان پردوں کے اندر جھانک سکے اور چھپے ہوئے گہرے معنی دریافت کر سکے۔ فراق کی شعری کائنات میں حکمت اور خردمندی کے خزانے پوشیدہ ہیں جس سے انکار کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ فراق کی بعض نظموں میں ہندوستان کا ہزاروں برس پرانا ماضی، اس کی بہترین تہذیبی روایات واقدار، بچپن کی یادیں، عشق ومحبت کی ان گنت پرچھائیاں اس فراوانی کے ساتھ موجود ہیں کہ ان کو دیکھ کر دیدۂ حیرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔

## 11.3.2 فراق گورکھپوری کی شعری خصوصیات

فراق گورکھپوری اپنی شاعری کے محاسن پر خود روشنی ڈالتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''مجھے اپنی غزلوں میں ایک ایسے سہانے پن کو پیدا کرنا تھا جو نور کے تڑکے میں ہوتا ہے۔ جو سکوت نیم شبی میں ہوتا ہے۔ فطرت کے پس منظر اور پیش منظر میں، گھر اور گھریلو زندگی میں

ہوتا ہے اور جنسی زندگی کے ایسے شعور میں ہوتا ہے جو رام اور سیتا، نل دمینتی، ساوتری ستیہ وان، رادھا اور کرشن، میگھ ناتھ اور سلوچنا، شیو اور پاروتی اور ہندوستانی ثقافت کے پیدا کردہ مردوان کے باہمی تعلقات میں زندہ جاوید کردیا گیا ہے۔''

فراق کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں محبوب کی مرقع کشی اس انداز سے کی ہے اور تشبیہ و استعاروں کے پردے میں چھپا کر اس طرح پیش کیا ہے ان کا محبوب اردو کے عام محبوب کی طرح غیر ملکی نہیں معلوم ہوتا ہے اس کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ ہندوستان کی مٹی سے بنائی گئی یہ تصاویر نہایت دلآویز معلوم ہوتی ہیں۔فراق کا محبوب اپنی پوری دلکشی اور رعنائی کے ساتھ ان کی غزلوں، نظموں اور رباعیوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ کوئی غیر مرئی اور خیالی محبوب نہیں ہے۔ فراق نے یہ وصف خود اپنی افتادطبع سے بھی اور میر کی طرف واضح رجحان کے سبب حاصل کیا ہے۔ان کے جمالیاتی احساسات میں کثافت سے لطافت اور ماورائیت سے روحانیت کی حدیں جدا نہیں ہونے پاتیں۔ ان کے یہاں جنس کے تقدس اور طہارت کا جو تصور ملتا ہے وہ انھوں نے ہندو فلسفے سے اخذ کیا ہے۔اس فلسفے میں جنس ایک مقدس جذبہ ہے جس کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، جو قابلِ پرستش ہے،فراق بنیادی طور پر حسن کی جسمانیت کے شاعر ہیں جو جسم اور اس کے لمس سے روحانی سرور اور انبساط حاصل کرتے ہیں۔فراق نے اپنے محبوب کے بدن کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔

شعلہ ریز، پردۂ ساز، تمام بادِ بہاری، تمام خندۂ گل، شمیم زلف کی ٹھنڈک، گونجتے ہوئے ناتراشیدہ نغمے، ساز جا، سرمدی فن کا شاہ کار وغیرہ۔فراق کی آواز میں دھیما پن، گھلاوٹ اور نرمی ہے۔ان کے کلام میں سوز و گداز اور غنائیت اور میٹھا میٹھا درد محسوس ہوتا ہے غزلوں اور نظموں میں ہندوستانی تلمیحات،صنمیات، اساطیری روایات اور قصص کو داخل کر کے ایک بالکل ہی نئی اور انوکھی فضا بندی کی ہے جو فراق سے قبل ہماری شعری روایت میں اس انداز سے کہیں نظر نہیں آتی۔

## تصانیف

(1) کلیات فراق (2) گلِ نغمہ (3) اردو کی عشقیہ شاعری (4) روپ (سنگارس رس کی رباعیاں) (5) گلِ بانگ

## فراق کا ادبی مقام و مرتبہ

فراق کی شاعری کا کینوس بہت وسیع نہیں ہے، انھوں نے اپنے آپ کو عشقیہ روایت، جنسی روحانیت اور رومانی احساسات کے بیان سے بہت آگے نہیں بڑھایا ہے، لیکن اس قدر محدود دائرے میں بھی انھوں نے شاعری کو خطابت یا راست بیانی کے عیب سے بچالیا ہے۔اپنی زبان اور اظہار کو شاعرانہ آداب کا پابند بنایا ہے اور شاعری کے جمالیاتی کردار کو ہر صورت میں باقی رکھنے کی کوشش کی ہے، اس لحاظ سے بھی اور اس وصف کے سبب کہ وہ روایت سے چمٹے رہنے کے بجائے اپنی الگ نئی اور الگ پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں، جس میں زبان، محاورہ، استعارہ، تلمیحات، تمثال سازی سب نے مل کر اپنے اپنے جوہر دکھائے ہیں تخلیقی کارگزاریوں نے فراق کو اردو شعرا میں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت عطا کی ہے۔

## 11.3.3 فراق گورکھپوری کی غزلوں کی تشریحات

### غزل 1

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

مری نظریں بھی ایسے کافروں کی جان و ایماں ہیں
نگاہیں ملتے ہی جو جان اور ایمان لیتے ہیں

جسے کہتی ہے دنیا کامیابی وائے نادانی
اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں

نگاہِ بادہ گوں یوں تو تری باتوں کا کیا کہنا
تری ہر بات لیکن احتیاطاً چھان لیتے ہیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
تو ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا
اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں

حیات عشق کا اک اک نفس جام شہادت ہے
وہ جانِ ناز برداراں کوئی آسان لیتے ہیں

ہم آہنگی میں بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی
مری باتیں بعنوان دگر وہ مان لیتے ہیں

تری مقبولیت کی وجہ واحد تری رمزیت
کہ اس کو مانتے ہی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں

اب اس کو کفر مانیں یا بلندیٔ نظر جانیں
خدائے دو جہاں کو دے کے ہم انسان لیتے ہیں

جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبارِ الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر نقصان لیتے ہیں

ہماری ہر نظر تجھ سے نئی سوگندھ کھاتی ہے
تو تیری ہر نظر سے ہم نیا پیمان لیتے ہیں

رفیق زندگی تھی اب انیس وقتِ آخر ہے
ترا اے موت ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں
زمانہ وارداتِ قلب سننے کو ترستا ہے
اسی سے تو سر آنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں
فراق اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

## تشریح

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

شاعر یہاں اپنے محبوب کا ذکر کر رہا ہے اور اسے اپنی زندگی کہتا ہے۔ ظاہر ہے کون ہوگا جسے اپنی زندگی سے محبت نہیں ہوگی۔ زندگی نہ ہوگی تو موت ہوگی۔ محبوب کے قدموں کی رفتار سے جو آہٹ ہوتی ہے شاعر کو پتہ چل جاتا ہے کہ کون آ رہا ہے۔ شاعر کی زندگی محبوب کے قدموں کی آہٹ پر ہی منحصر ہے۔

مری نظریں بھی ایسے کافروں کی جان و ایماں ہیں
نگاہیں ملتے ہی جو جان اور ایمان لیتے ہیں

شاعر اس شعر میں اپنی نظروں کو ایسے کافروں کی جان و ایمان قرار دیا ہے (یہاں کافر سے مراد محبوب ہے) جن کے نگاہ ناز سے ملتے ہی جان اور ایمان دونوں کے جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

جسے کہتی ہے دنیا کامیابی وائے نادانی
اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں

دنیا جس چیز کو کامیابی تصور کرتی ہے شاعر اس مقام پر افسوس کرتا ہے اور اس تصور کو نادانی قرار دیتا ۔ اس لیے کہ ایک کامیاب انسان کسی بھی قیمت پر ایسے گھاٹے کا سودا نہیں کرے گا۔

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
تو ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

شاعر کا کہنا ہے کہ رات کے سنّاٹے اور تنہائی میں جو محبوب سے دوری کی وجہ سے ہے۔ جب طبیعت گھبراتی ہے تو محبوب کی یاد سے بڑا سکون ملتا ہے۔ یاد کی چادر۔ خوبصورت شعری ترکیب ہے (چادر اوڑھ کر آدمی سو جاتا ہے) شاعر کے پاس یاد کی چادر ہے جس کو اوڑھ کر وہ سکون سے سو جاتا ہے۔

خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا
اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ عشق میں اپنے فیصلے کی کوئی وقعت نہیں ہے کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ اس کے دل میں جو

باتیں ہیں وہ اس پرعمل پیرا بھی ہوئے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عشق میں طرفین کا فیصلہ حدنظر ہو۔

حیات عشق کا اک اک نفس جام شہادت ہے
وہ جانِ ناز برداراں کوئی آسان لیتے ہیں

عشق میں گزاری گئی ایک ایک سانس جامِ شہادت کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ سانس کا گزرنا در حقیقت زندگی میں تحقیق کی علامت ہے اس لیے محبوب کے عشق میں مبتلا ہونا اور ہر لمحہ جامِ شہادت نوش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے

ہم آہنگی بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی
مری باتیں بعنوان دگر وہ مان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ متفق الّرائے میں بھی اختلاف کی گنجائش رہتی ہے بلکہ اختلاف رائے کا ہونا ضروری بھی ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ اپنی بات کو دوسرے طور پر منوایا جا سکتا ہے۔

تری مقبولیت کی وجہ واحد تری رمزیت
کہ اس کو مانتے ہی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں

شاعر اپنے محبوب کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ تیری مقبولیت کی صرف اور صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تیرا اشارے اور کنائے میں باتیں کرنا اس لیے کہ مفصل باتیں لوگ ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ صورت سے میں انسان کی سیرت کا پتہ اس طرح چل جاتا ہے جس طرح عبارت کو دیکھ کر معانی کی تفہیم ہو جاتی ہے۔

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبارِ الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر نقصان لیتے ہیں

یہاں شاعر دکھ کے ساتھ اور طنز میں کہتا ہے کہ اس زمانے میں محبت بھی تجارت بن گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس راہ پر چلنے میں کوئی نقصان ہے تو اس کی تلافی وہ خود کرے گا، محبوب کو ہرگز اس زحمت میں مبتلا نہیں کرے گا۔

ہماری ہر نظر تجھ سے نئی سوگندھ کھاتی ہے
تو تیری ہر نظر سے ہم نیا پیان لیتے ہیں

فراق اپنی شاعری میں محبوب کی نظر سے اکثر گفتگو کرتے ہیں۔ اس شعر میں وہی انداز گفتگو ہے۔ محبوب کی زندگی میں نظر سے گفتگو کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ساری گفتگو نظر سے ہی ہوئی ہے۔ یہاں شاعر (عاشق) کی نظر وفاداری کی قسمیں کھا رہا ہے تو محبوب کی نظروں سے بھی کچھ وعدے کا طلبگار ہو رہا ہے۔

یادداشتیں

رفیق زندگی تھی اب انیس وقتِ آخر ہے
ترا اے موت ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں

یہاں شاعر نے رفیق اور انیس کے معنی میں فرق کیا ہے۔ دونوں کے معنی دوست ہیں،لیکن رفیق کے مقابلے میں انیس زیادہ قریب ہے۔شاعر یہاں موت سے اپنی دوستی کا ذکر کر رہا ہے جو یوں تو تمام عمر کسی نہ کسی طرح اس کے ساتھ رہی ہے لیکن زندگی کے وقت آخر میں اس کے ہونے سے تمام دکھوں کا خاتمہ ہو گیا ہے، جس کو شاعر یہاں موت کو دوسرا احسان کہہ رہا ہے۔

زمانہ وارداتِ قلب سننے کو ترستا ہے
اسی سے تو سر آنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں

فراق نے اس میں اپنی شاعری کو عوام الناس کی وارداتِ قلب قرار دیا ہے۔جس کی وجہ سے ان کے دیوان کو سر آنکھوں پر لیتے ہیں اور ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔

فراق اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

یہاں شاعر نے اپنے محبوب کو کافر کہا ہے۔محبوب اپنے عاشق کو ستانے کے لیے اکثر بھیس بدلتا رہتا ہے تا کہ اسے پہچانا نا جا سکے لیکن فراق ان عاشقوں میں ہیں جو محبوب کی ان اداؤں سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ وہ جس لباس میں بھی ہوتا ہے وہ اسے پہچان بھی لیتے ہیں اور جان بھی لیتے ہیں۔

## غزل 2

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

شکوۂ جور کرے کیا کوئی اس شوخ سے جو
صاف قائل بھی نہیں، صاف مکرتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بیجا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

یادداشتیں

آج غفلت بھی ان کی آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطر بیمار شکیبا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکون دل وحشی کا مقام
کنج زنداں بھی نہیں وسعت صحرا بھی نہیں

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں
تونے کچھ آہ سنا بھی نہیں، دیکھا بھی نہیں

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراق سخن آرا بھی نہیں

## تشریح

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

یہاں شاعر محبت کی زندگی میں اپنی حالت بیان کر رہا ہے۔وہ کہتا ہے کہ سر میں نہ تو اب محبت کا سودا (جنون) رہ گیا ہے اور نہ دل میں کوئی خواہش ہی باقی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ محبت ختم ہو چکی ہے۔لیکن میں محبت کے بغیر کب تک رہ سکوں گا یہ کہنا بھی میرے لیے بہت مشکل ہے۔

دل کی گنتی نہ یگانوں میں بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

شاعر کا کہنا ہے کہ میرے دل اور میری محبت کی کچھ خاص اہمیت نہیں ہے۔محبوب ہمیں اپنے پرائے کسی میں بھی شمار نہیں کرتا (پرائے میں شمار کیا جاؤ تو کچھ تعلق کا پتہ چلتا ہے) محبوب کے اس سلوک کے باوجود بھی دل کا یہ عالم ہے کہ اس کو سکون اگر ملتا ہے تو محبوب کی ہی محفل میں ملتا ہے۔

شکوۂ جور کرے کیا کوئی اس شوخ سے جو
صاف قائل بھی نہیں صاف مکرتا بھی نہیں

یہاں شاعر اپنے محبوب کو شوخ کہتا ہے جو عاشق سے عشق کرنے کے بجائے مذاق کرتا ہے۔اس کی شوخی یہ ہے کہ وہ محبت کا نہ تو قائل ہے اور نہ ہی اس سے انکار کرتا ہے۔اب اس زیادتی کی شکایت بھی اگر کی جائے تو کس سے کی جائے۔

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بیجا بھی نہیں

فراق کے اس مشہور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عشق اور مہربانی میں بہت فرق ہوتا ہے۔مہربانی کرنا محبت نہیں ہوسکتا۔شاعر کا خیال ہے کہ محبوب کی بے جا رنجش (غصے) سے بھی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔لیکن اگر اس کی طرف سے

مہربانی شروع ہو جائے تو پھر اسے محبت کا خاتمہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ یوں تو حالتِ زمانہ کی وجہ سے بہت عرصہ سے تیری یاد نہیں آئی لیکن اس سے اگر سمجھا جائے کہ میں تجھے بھول گیا ہوں تو یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔

آج غفلت بھی ان کی آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطر بیمار شکیبا بھی نہیں

شاعر اس میں محبوب کی عدم توجہی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آج محبوب میری طرف سے کچھ زیادہ ہی لا پرواہ ہو گیا ہے جبکہ میرے دل کی یہ حالت ہے اسے ایک بھی لمحہ محبوب کو دیکھے بغیر سکون نہیں ہے۔

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں
تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں، دیکھا بھی نہیں

شاعر اس میں صیاد کے عدم بصیرت کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے اس سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ دراصل ہمیں گل بھی ہیں اور ہمیں بلبل بھی ہیں یہ تیری لاعلمی ہے جو تو مجھے نہیں سمجھ سکا ہے اس پر کتنا ہی آہ و فریاد یا افسوس کیا جائے کم ہے۔

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراقؔ سخن آرا بھی نہیں

شاعر اپنی عظمت کا احساس دلانا چاہتا ہے۔اس وقت کو یاد دلانا چاہتا ہے جب اس کی سخن آرائی (شاعری) اس کی موت کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔دوستوں کا مجمع ہوگا لیکن محفل پر خاموشی اور اداسی طاری ہوگی۔

## 11.4 آپ نے کیا سیکھا

1. فراق کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوئے۔
2. فراق کے کلام کی خصوصیات کو سمجھا۔
3. فراق کے عہد کی سیاسی، سماجی حالت کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔
4. فراق کی دو غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔
5. فراق کے ہم عصر شعرا کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

## 11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. فراق نے اپنی غزلوں کی کن خصوصیات کو بیان کیا ہے۔
2. فراق نے کن اصناف میں شاعری کی اور ان کے موضوعات کیا تھے۔

3. فراق کی شاعری کی چند اہم خصوصیات بیان کیجئے۔
4. فراق کی غزل آپ کو کیوں متاثر کرتی ہے۔
5. ادبی تاریخ میں فراق کا کیا مرتبہ ہے۔

## 11.6 فرہنگ

| | | |
|---|---|---|
| وائے | = | کلمۂ افسوس جو اظہارِ مصیبت یا رنج والم کے موقع پر زبان پر آتا ہے |
| نَفَس | = | سانس، دم |
| جامِ شہادت | = | شہادت کا پیالہ |
| ہم آہنگی | = | اتفاق رائے |
| بعنوان دگر | = | دوسرے عنوان سے |
| رمزیت | = | آنکھوں بھوؤں یا ہونٹوں سے اشارہ کرنا |
| پیمان | = | عہد، قسم، شرط، وعدہ |
| وارداتِ قلب | = | دل پر گزری ہوئی باتیں |
| رفیق | = | دوست |
| انیس | = | دوست |
| سودا | = | جنون، خبط، عشق، دھن، لگن |
| یگانہ | = | اپنا |
| بیگانہ | = | پرایہ |
| شکوۂ جور | = | ظلم وزیادتی کی شکایت کرنا |
| خاطر بیمار | = | لاغر وکمزور دل |
| شکیبا | = | صبر |
| کنج زنداں | = | قید خانے کا گوشہ یا کنارہ |
| صحرا | = | جنگل |
| صیاد | = | شکاری |
| مجمع احباب | = | دوستوں کا مجمع |
| سخن آرا | = | سخن: بات، کلام، آرا: سنوارنے والا، سخن آرا: اچھی بات چیت کرنے والا |

## 11.7 سوالوں کے جوابات:

1. فراق نے اپنی غزل گوئی کے بارے میں لکھا ہے کہ

''میں نے اپنی غزلوں میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ اس مغربی اور مقبول عام ہندی کو جس کا نام اردو زبان و ادب ہے زیادہ سے زیادہ اور اس میں گنگ و جمن کے دو آبے کی شادابی اور انسانی تہذیب کے اس حسن کو سمودوں تا کہ میری غزلوں میں سطحیت، کرّا پن خیر و برکت کے عناصر سے محرومی اور دوسرے بیمار عناصر جگہ نہ پانے پائیں اور میری غزلوں میں تہذیب ہند اور تہذیب عالم کا حقیقی ترنم گونجے۔ میں نے چاہا ہے کہ میری شاعری اس دھرتی کی شاعری رہے یعنی اس میں وہ دھرتی بولتی ہوئی اور رقص کرتی ہوئی سنائی اور دکھائی دے جو کروڑوں سال پرانی ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ اپنے آپ کو نیا کرتی رہتی ہے۔ وہ دھرتی جو سدا سہاگ اور سدا بہار ہے۔''

2. فراق کا زیادہ تر کلام غزلوں پر مشتمل ہے لیکن انھوں نے بہت عمدہ نظمیں بھی لکھیں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں جو ان کے تصورات حسن و عشق پر مبنی ہیں۔ لیکن ان کی عظمت اور مقبولیت کا دارو مدار ان کی غزلوں پر ہے۔ فراق کے بنیادی موضوعات تو حسن و عشق ہی ہیں خصوصاً جسمانی لذت اور جنس کے گرد ان کی فکر چکّر کاٹتی ہے لیکن انھوں نے زندگی اور کائنات کے بارے میں اپنے مشاہدات، تجربات اور تصورات کو بھی بڑے موثر اور دلنشین پیرایئے میں پیش کیا ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے شعری تنوع ہے۔ فکر میں گہرائی ہے اور پرتیں ہیں جن پر غور سے معنی کی کئی سطحیں سامنے آتی ہیں۔ فراق ایک پختہ کار فنکار ہیں جو اس امر سے واقف نہیں کہ شاعری بیان واقع یا خطابت نہیں ہے بلکہ الفاظ کا تخلیقی استعمال ہے۔ تخلیقی استعمال میں زبان اپنے امکانات بروئے کار لاتی ہے۔ اس میں چھپے ہوئے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ فراق کی شاعری میں ان جواہر پاروں کی بڑی کثرت ہے جس کے پڑھنے سے لطف و لذت بھی حاصل ہوتی اور خود آگہی و بصیرت بھی۔

3. فراق کی شاعری کی یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں لیکن انھوں نے اردو کی عشقیہ شاعری کی روایت میں جو اضافے کیے ہیں وہ بے حد قابل تعریف ہیں۔ انھوں نے محبوب کی مرقع کشی جس انداز سے کی ہے وہ ہماری شاعری کی روایتی (Ideal) محبوب سے بالکل مختلف ہے۔ فراق کا محبوب ایک عام گھریلو عورت ہے، جو اپنی ہندوستانی پہچان رکھتا ہے، یہاں کی تہذیبی زندگی اور رسوم و قیود میں رہتے ہوئے ہم سے بہت مانوس ہے۔ تاہم اس کی نزاکت، ادا اور شوخی کو جس طرح فراق نے بیان کیا ہے۔ وہ بس انھیں کا حصہ ہے اس طرح سے پہلے کسی شاعر سے عشقیہ محسوسات اور واردات کو کم ہی پیش کیا ہے۔

4. فراق کی غزلیں ہر پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہیں، اس کا بنیادی سبب اس میں درد و کرب کی ایک دھیمی دھیمی آنچ اور چبھن ہے اس لیے کہ عاشق دل گرفتہ محبوب سے ملنے کے لیے بے قرار ہے اور موجودہ دور کا محبوب بھی زندگی کے جھمیلوں اور مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ اس کے پاس عشق کرنے اور قربت کی لذتوں کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ یہ وقت کی ستم ظریفی ہے جس نے عاشق اور معشوق دونوں کو حالات کے جبر کا شکار کر رکھا ہے۔ فراق کو پڑھتے ہوئے میر تقی میر کا خیال آتا ہے جن کی غزلوں میں درد و کسک کی کیفیت دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے فرق صرف یہ کہ میر کا محبوب روایتی ہے اور فراق کا محبوب ہماری مانوس

دھرتی اور ماحول ہی میں پلا بڑھا ہے جس پر کسی قسم کا ماورائیت کا ہالہ نہیں ہے۔ یہی خوبیاں ہیں جو فراق کا کلام پڑھتے ہوئے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔

5. شعر و ادب کی تاریخ میں فراق کا مقام یقیناً محفوظ ہے۔ انھوں نے اپنی عشقیہ شاعری کے نسبتاً محدود دائرے میں بھی، جنس سے غیر معمولی رغبت اور جسمانی حسن، لمس اور لذت کو بیان کرنے کے باوجود جس طرح شاعری اور غیر شاعری کے تقاضوں کو سمجھا اور برتا ہے اس کی وجہ سے ان کی شاعری کی جمالیاتی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہی وہ اوصاف ہیں کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا اس میں آب و تاب کا احساس بڑھتا جائے گا۔

## 11.8 کتب برائے مطالعہ

1. کلیاتِ فراق
2. فراق شاعر اور شخص — شمیم حنفی
3. فراق گورکھپوری — ڈاکٹر فضل حق، کامل قریشی
4. گلبانگ — فراق گورکھپوری
5. فراق گورکھپوری — حیات، شخصیت اور کارنامے

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

# اکائی نمبر 12 جوش ملیح آبادی کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ

## ساخت


12.1 اغراض و مقاصد

12.2 تمہید

12.3 جوش ملیح آبادی کی شاعری

12.3.1 جوش ملیح آبادی کا تعارف

12.3.2 جوش ملیح آبادی کی شعری خصوصیات

12.3.3 نظم ''بدلی کا چاند'' کی تشریح

12.4 آپ نے کیا سیکھا

12.5 اپنا امتحان خود کیجیے

12.6 فرہنگ

12.7 سوالوں کے جوابات

12.8 کتب برائے مطالعہ


## 12.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مقصد اردو شاعری بالخصوص نظموں کو نئی آب و تاب عطا کرنے والے شاعر جوش ملیح آبادی کی نظم ''بدلی کا چاند'' کا مطالعہ کرانا ہے۔ اس اکائی میں جوش ملیح آبادی کا تعارف اور ان کے کلام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کی نظم ''بدلی کا چاند'' کی تشریح کی گئی ہے اور اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- جوش ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی سے متعلق واقفیت حاصل کریں گے۔
- جوش کے کلام کی خصوصیات بیان کر سکیں گے۔
- جوش کی نظموں کے موضوعات اور ان کے برتنے کے طریقے سے واقف ہوں گے۔
- اس عہد کے تمام شعری مزاج سے واقفیت حاصل کریں گے۔

## 12.2 تمہید

اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں جوش ملیح آبادی کا ایک معتبر نام ہے۔ جدید شاعری میں جوش نے کئی اہم اضافے کیے ہیں۔ جہاں انھوں نے ماضی کی عظیم شعری روایات سے روشنی حاصل کی ہے۔ وہاں جا بجا روایت شکنی سے بھی کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنوع اور رنگا رنگی کا پہلو ان کی شاعری میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے بعد دوسرے بڑے شاعر جوش ملیح آبادی کا نام نظم نگار کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ جوش

کے معاصرین میں حفیظ جالندھری، مجاز لکھنوی، احسان دانش، فراق گورکھپوری اور علی سردار جعفری وغیرہ ہیں۔ انھوں نے سماجی، سیاسی اور فطرت کی زندگی اور مظاہرِ حسن پر جتنا لکھا ہے دوسرے کسی شاعر نے نہیں لکھا۔ جوش نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور رباعیاں بھی لیکن وہ بنیادی طور پر نظم گو کی حیثیت سے ہمارے سامنے اُبھر کر آتے ہیں۔

## 12.3 جوش ملیح آبادی کی شاعری

### 12.3.1 جوش ملیح آبادی کا تعارف

جوش ملیح آبادی 5 دسمبر 1894 کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی نام شبیر احمد خاں تھا۔ 1907 میں یہ نام بدل کر کے شبیر حسن خاں رکھ لیا۔ بعد میں جوش تخلص اختیار کیا۔ نسلاً وہ آفریدی پٹھان تھے اور ایسے جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں دولت و ثروت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی پرورش ایک زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ جوش کے پردادا کا نام فقیر محمد گویا تھا، وہ نواب ہونے کے ساتھ ساتھ علم دوست و ادب نواز بھی تھے۔ وہ لکھنؤ کے مشہور شاعر امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'دیوان گویا' کے نام سے مشہور ہے۔ جوش کے دادا نواب احمد خاں بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ ان کے والد نواب بشیر احمد خاں بھی شعر و ادب کے استاد تھے۔ بقول جوش ان کے گھر بارہ مہینے کوئی نہ کوئی ادیب یا شاعر مہمان رہا کرتا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے خاندان میں ان کے پردادا سے ہی شعر گوئی کی روایت قائم تھی جسے جوش نے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اپنی جوشیلی طبیعت سے خوب جلا بخشی۔

جوش نے حسبِ دستور ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اپنے اساتذہ سے گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ نیز دیوانِ حافظ وغیرہ کا درس لیا۔ جوش نے اُردو کی تعلیم مولوی طاہر علی سے، عربی مولوی قدرت اللہ بیگ سے، فارسی مولوی نیاز علی سے اور انگریزی ماسٹر گومتی پرساد سے سیکھی۔ یہ سبھی اساتذہ اس زمانے کے اودھ کے مانے ہوئے عالم تھے۔ ان کی مزید تعلیم سیتا پور، لکھنؤ ایم.اے.او کالج علی گڑھ اور سینٹ پیٹرس کالج آگرہ سے ہوئی۔ اس کالج سے انھوں نے سینئر کیمبرج کیا۔ ابھی وہ دوسرے سال میں تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ جوش تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملیح آباد واپس چلے آئے اور آبائی ریاست کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی زندگی میں ایک طوفان سا آ گیا۔ دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں نے نگاہیں پھیر لیں۔ زندگی سنسان و ویران نظر آنے لگی اور جوانی کی پہلی سیڑھی یعنی شادی بھی ان کے والد نے 1907 میں اپنے چچا زاد بھائی محمد مقیم خاں کی بیٹی اشرف جہاں سے کردی تھی۔ خانگی مسائل نے جوش کو آ گھیرا۔ ادھر جوش حافظ، ٹیگور اور خیام سے متاثر ہو رہے تھے، انھیں سب حالات نے انھیں دنیا کی بے ثباتی کا احساس بھی دلا دیا تھا۔ اسی لیے ان کے پہلے مجموعے 'روحِ ادب' کی پہلی نظم 'ترانۂ بیگانگی' اس کیفیت کی ترجمان ہے۔ 1916 سے 1925 تک کے درمیان جوش کا دل بڑی حد تک زندگی کی لذتوں سے اُچاٹ ہوگیا تھا۔

1924 میں جوش کی زندگی میں بڑی تبدیلی کے نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے معقول ذریعۂ آمدنی

کی فکر میں حیدر آباد کا قصد کیا۔ وہاں ان کا تقرر دارالترجمہ میں ناظر ادب کے عہدے پر ہوا۔ اسی زمانے میں جوش نے حیات بیکن اور شیکسپیئر کا ترجمہ کیا۔ حیدر آباد کی زندگی جوش نے کبھی فراموش نہیں کی۔ 1936 میں بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر حیدر آباد سے دہلی چلے آئے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف کام کیے مثلاً 1935 میں دہلی سے ایک ماہ نامہ 'کلیم' جاری کیا جو عوام وخواص دونوں میں مقبول ہوا۔ رسالے کے ذریعے جوش نے نثر نگاری میں بھی اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا۔ چار سال پابندی سے نکلنے کے بعد مالی دشواری کے سبب ترقی پسندوں کے ماہنامے 'نیا ادب' میں ضم ہوگیا، جوش اس کے مدیر مقرر ہوئے اور 1961 تک اس کی ادارت کی۔ ماہنامہ 'کلیم' میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ 1962 میں 'اشارات' کے نام سے شائع ہوا۔ اسی دوران کے مختلف شعری مجموعے مثلاً نقش ونگار، شعلہ، وشبنم، فکر و نشاط، جنون وحکمت، صرف وحکایت اور آیات ونغمات وغیرہ شائع ہوئے۔ اس کے بعد جوش کچھ عرصہ فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ پونا کی ایک فلم کمپنی میں ملازمت کرلی اور اس سلسلے میں کئی سال تک ممبئی میں مقیم رہے۔ ان کے فلمی گیت بھی کافی مقبول ہوئے۔ ملک کو آزادی ملنے کے بعد انھوں نے محکمہ اطلاعات ونشریات کے ماہنامہ 'آجکل' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ 1955 سے 1968 تک انھوں نے اس رسالے کی کامیاب ادارت کی۔ اب جوش کی شہرت میں چار چاند لگ چکے تھے۔ ہر طرف ان کی آؤ بھگت اور پذیرائی ہونے لگی تھی۔

انھیں شاعرِ انقلاب کے لقب سے نوازہ گیا اور شاعرِ اعظم کے لقب سے یاد کیا گیا۔ بعد میں شاعرِ فطرت، شاعرِ شباب، مصورِ فطرت اور شاعرِ رومان وغیرہ کہے جانے لگے۔ جوش نے اُردو زبان اور ہندوستان کو اپنی شاعری کے ذریعے بیش بہا جواہر عطا کیے۔ ان کی انھیں گراں قدر خدمات کی بنا پر حکومت ہند نے 1955 میں پدم بھوشن سے نوازا۔ اس کے کچھ عرصے بعد اچانک جوش نے اپنے سفر کی باگ پاکستان کی طرف موڑ دی یعنی وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ ہجرت سے قبل ان کے کچھ اور شعری مجموعے 'عرش وفرش'، 'راش ورنگ'، 'سنبل وسلاسل'، 'سیف وسبو'، 'سرود وخروش'، 'سموم وصبا' اور 'طلوعِ فکر' منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ جوش کو پاکستان میں بڑی دشواریوں سے گزرنا پڑا۔ ایک طرف فکرِ معاش تھی دوسری طرف ادبی گروہ بندیاں، ترقی اُردو بورڈ کراچی میں اُردو لغت سازی کے کام سے بحیثیت مدیر وابستہ ہوگئے۔ رسالہ 'اُردو نامہ' کی بھی ادارتی ذمے داریاں نبھاتے رہے۔ ہجرت کے بعد شعری مجموعے 'الہام وافکار'، 'نجوم وجواہر' اور مشہور خودنوشت 'یادوں کی برات' شائع ہوئی۔ 22 فروری 1982 کو اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے ساتھ اُردو شاعری کی ایک عظیم روایت ایک بڑے دور اور زبان و بیان کے منفرد انداز کے دبستان کا خاتمہ ہوگیا۔

### 12.3.2 جوش ملیح آبادی کی شعری خصوصیات

اُردو شعر وادب کی تاریخ میں جوش ملیح آبادی کا ایک معتبر نام ہے۔ یوں تو ان کی شناخت بہ حیثیت شاعرِ انقلاب کے ہوتی ہے مگر انھیں شاعرِ شباب اور شاعرِ فطرت ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ انھوں نے بعض دشوار اہم اور قطعی نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ وہ انسانی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں

اور بہت ہی چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتوں کو بھی اپنی شاعری کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ بعض ہنگامی موضوعات کو بھی اپنی شاعری میں نمایاں کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کی نجی زندگی اور اس عہد کی اجتماعی زندگی دونوں ہم آہنگ ہوگئے ہیں۔ جوش کا اپنی شاعری کے بارے میں خود خیال ہے کہ اس میں جمالی اور جلالی دونوں کیفیتیں ایک ساتھ نمایاں ہیں۔ ان کی غزلوں، رُباعیوں اور غیر سیاسی نظموں کا لہجہ بالکل مختلف ہے۔ ان میں شگفتگی، دھیما پن اور طنزیہ انداز نمایاں ہے۔

ملک میں انگریزوں کی ظالمانہ حکومت اور سیاست نے ان کے خون میں اُبال پیدا کردیا۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جس طرح محنت کش انسانوں کا استحصال کیا یہاں تک کی معیشت کو تباہ و برباد کیا۔ غریبوں، کمزوروں، کسانوں اور مزدوروں پر ظلم و زیادتی کی، وہ جوش کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اس بنا پر جوش کی سیاسی نظموں میں جذبہ بغاوت اور آزادی کی تڑپ کی لہریں بار بار سر اٹھاتی ہیں۔

جوش نے سماجی، سیاسی اور فطرت کی زندگی اور مظاہرِ حسن پر جتنا لکھا ہے دوسرے کسی شاعر نے نہیں لکھا۔ ان کے متعدد شعری مجموعے ہیں جن میں شامل نظمیں ان کے شعلۂ جذبات سے پُر ہیں جو نوجوانوں کو حرکت و عمل پر اُکساتی اور نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے قربانی اور خدمات پر آمادہ کرتی ہیں۔

جوش ملیح آبادی کی شاعری کا ایک اہم پہلو منظر نگاری اور فطرت کے بے بہا خزانوں کی جستجو ہے۔ جوش نے مناظرِ فطرت کو مختلف انداز سے اپنی شاعری میں شاعرانہ کمال کا مرقع بنا کر پیش کیا۔ قدرت کی رعنائیاں ان کے نزدیک کلامِ الٰہی کا درجہ رکھتی ہیں، وہ منظر نگاری کے لیے پوری کائنات پر نظر رکھتے ہیں اور جُز سے کُل کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ الفاظ کی مدد سے تخیلی پیکر تراشا جوش کی فطرت میں داخل ہے۔ اُردو شاعری میں جوش سے زیادہ الفاظ کا ذخیرہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی شاعری میں عام فہم اور موزوں الفاظ کو ہی موقع اور محل کے اعتبار سے جگہ دی ہے۔ الفاظ پر زبردست دسترس کے باوجود لفظوں کی جادوگری کے وہ کبھی اسیر نہیں ہوئے۔

جوش نے اپنی نظموں میں تشبیہات اور تراکیب سے حسن پیدا کیا ہے۔ جہاں تشبیہ اور استعارے کو اس کی فضا اور موقع محل کے اعتبار سے استعمال کیا وہیں تازگی اور ندرت پیدا ہوگئی ہے۔ جوش کی منظریہ شاعری کا پیمانہ جمالیاتی عناصر سے لبریز ہے۔ گویا ایک طرح سے فطرت اور رومان کا حسین امتزاج ان کی شاعری کا ایک خاص وصف ہے۔ جوش فطرت کی روح میں جھانک لیتے ہیں۔ وہ فطری مناظر کو بے جان نہیں سمجھتے۔

بحیثیت مجموعی جوش اپنے دور کے ایک اہم شاعر ہیں جنھوں نے لوگوں کو اپنے افکار سے نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ اپنی انفرادیت کو بھی تسلیم کرایا ہے۔ بالخصوص اُردو نظم پر جوش کے زبردست احسانات ہیں جسے اُردو شاعری کی تاریخ کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔

### 12.3.3 نظم ''بدلی کا چاند'' کی تشریح

## بدلی کا چاند

خورشید ، وہ دیکھو ڈوب گیا ، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب، وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

وہ سانولے پن پر میداں کے ، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا اُبھر کر بادل سے ، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں ، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں ، ظلمت کا قدم تھرّانے لگا

بادل میں چھپا تو کھول دیئے ، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں ، دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا تاریکی میں ، چاند کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے، امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے ، کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا ، دریا پہ تبسّم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی ، میدان کا دل گھبرانے لگا

اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی ، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
اُلجھا تو سیاہی دوڑا دی ، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوشِ نور وظلمت ہے ، کیا قید ہے ، کیا آزادی ہے
انسان کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

## تشریح

جوش کو انقلابی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے جہاں ایک طرف ملک اور قوم کو بیدار کیا ہے وہیں انھوں نے انسان کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ انسانی فطرت میں جہاں دوسرے احساسات اور تاثرات ہیں وہاں اس کی فطرت میں حرکت اور عمل بھی ہے۔

9 اشعار پر مشتمل 'بدلی کا چاند' کی خصوصیت یہ ہے کہ جوش ملیح آبادی نے ایک منظر کو مختلف تشبیہوں اور کیفیتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نظم کا ہر شعر ایک الگ کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ اس کیفیت کا اظہار مختلف شعری تشبیہات کے ذریعے شاعر نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ اس نظم میں جو روانی اور پرکاری ہے وہ اس نظم کی سب سے

بڑی خوبی ہے۔

خورشید، وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

چاند کے ڈوبنے کا مطلب اندھیرا ہے اس لیے شاعر نے کہا ہے کہ سورج کے ڈوبتے ہی تاریکی چھا گئی مگر اس اندھیرے کو دور کرنے کے لیے چاند نکل آیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ چاندنی نہیں بلکہ آسمان سے چاندی کے ورق برس رہے ہیں۔ چاندنی کو چاند کے ورق سے تشبیہ دے کر شعر میں زیادہ زور پیدا کیا گیا ہے۔

وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا اُبھر کر بادل سے، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

میدان، زمین اور پہاڑ چاند کی وجہ سے سانولے ہو گئے ہیں اور یہ سانولا پن ان کی خوبصورتی کا سبب ہیں۔ ابھی پورے طور پر چاند بادلوں سے باہر نہیں نکلا ہے۔ بلکہ اس نے صرف اپنی پیشانی بادلوں سے نکالا ہے۔

لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ابھی چاند کی چاندنی پوری طرح پھیلی بھی نہیں کہ ایک بادل کے ٹکرے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا یعنی اپنے اندر چھپالیا۔ بادلوں کے اوٹ میں ہونے کے باوجود چاند کی روشنی بادلوں کے سینہ کو چیر کر باہر آنا چاہتی ہے جس سے پورے عالم میں روشنی کی لکیریں پھیل گئیں اور گھٹاؤں کے چھٹتے ہی تاریکی دور ہوگئی، تمام عالم روشن ہوگیا۔

بادل میں چھپا تو کھول دیئے، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں، دریا کی طرح لہرانے لگا

شاعر اس شعر میں کہتا ہے کہ جب چاند بادل میں چھپ جاتا ہے اور اس کے چھپنے کی وجہ سے کہیں کہیں سے چاند کی روشنی جو باہر آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہیرے کی کھڑکی، یعنی شاعر یہاں ہیرے کی کھڑکی سے تشبیہ دیتا ہے۔ جب چاند آسمان پر پوری روشنی کے ساتھ آتا ہے تو دریا کی طرح لہرانے لگتا ہے۔ یہاں شاعر چاند کی روشنی کو دریا کی روانی سے مثال دیتا ہے۔

سمٹی جو گھٹا تاریکی میں، چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ تاریکی کے دور ہونے کے بعد چاند اس طرح سے نکلا جیسے کوئی کشتی دریا میں چل رہی ہے۔ ابھی اسی حالت میں تھی کہ ہوا کے ایک جھونکے نے چاند کو بادلوں میں دھکیل دیا بالکل اس طرح جیسے کوئی بھنور میں غوطے کھاتا ہے۔ بادلوں کو یہاں بھنور کہا گیا ہے۔

غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے، امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اس شعر میں شاعر کہتا ہے چاند جب بادلوں سے نکلا تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کھڑکی میں سے جھانک رہا ہے اور اس کی روشنی سے دریا کی لہروں میں تیزی پیدا ہوگئی ہے اور اس کا اثر دریا کے لہروں پر پڑا اور اس کے چھپ جانے کا اثر پہاڑوں پر ہوا۔ اندھیرے کی وجہ سے گھبراہٹ پیدا ہوئی جس کو شاعر نے پہاڑ کے سر چکرانے سے تعبیر کیا ہے۔

پردہ جو اٹھایا بادل کا ، دریا پہ تبسّم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی ، میدان کا دل گھبرانے لگا

اس شعر میں ایک نئی تشبیہ پیش کی گئی ہے یعنی بادل کو پردہ کہا ہے جو چاند کے چہرے پر پڑا ہوا ہے۔ جیسے ہی پردہ اٹھا ایسا معلوم ہوا کہ دریا کی لہریں ہنس رہی ہیں۔ اب یہاں پر شاعر نے دریا کی لہروں کو ہونٹوں کی ہنسی سے تشبیہ دی ہے۔ بدلی نے جیسے ہی پردہ گرایا یعنی چاند بادلوں میں چھپ گیا تو میدان میں اندھیرا چھا گیا، اور اس اندھیرے کی وجہ سے میدان کا دل گھبرانے لگا۔

اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی ، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
اُلجھا تو سیاہی دوڑا دی ، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

جیسے ہی چاند سامنے آتا ہے تو تمام زمین و آسمان روشن ہو جاتے ہیں، اور جب چاند چھپ جاتا ہے تو آسمان اور زمین پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

کیا کاوشِ نور وظلمت ہے، کیا قید ہے، کیا آزادی ہے
انسان کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

آخری شعر میں شاعر دراصل پوری نظم کا نچوڑ بیان کرتا ہے۔ انسانی فطرت کا موازنہ چاند کے چھپنے اور نکلنے سے کرتا ہے۔ روشنی، تاریکی، غلامی اور آزادی کی جدوجہد اور کشمکش ہر زمانے میں رہی ہے بالکل اسی طرح جیسے چاند اندھیرے سے نکل کر روشنی کی جانب آنے کے لیے مسلسل کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح حضرت انسان بھی زندگی کے اندھیروں سے نکل کر اُجالے کی جانب جانے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک انسان خواہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو مگر فطرت اسے نیکی کی طرف ہی لے جائے گی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ انسان اگر اندھیرے میں وقت گزار رہا ہے تو یہ اس کی مجبوری ہے۔ وہ روشنی کا ہمیشہ طلب گار رہے گا۔ اس نظم میں انسانی فطرت کی جدوجہد کی طرف اشارہ ہے۔

## 12.4 آپ نے کیا سیکھا

1. جوش ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوئے۔
2. ملازمت کے سلسلے میں جوش حیدر آباد، دہلی اور ممبئی میں رہے۔ بعد میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے ان تمام چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کی۔
3. جوش شاعر انقلاب اور شاعر شباب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھیں مناظرِ فطرت اور نسائی حسن سے گہرا لگاؤ تھا، اس کے بارے میں آپ نے واقفیت حاصل کی۔

یادداشتیں

4. جوش کی نظم نگاری سے واقف ہوئے۔
5. جوش ملیح آبادی کو انگریزوں سے جو نفرت تھی اس سلسلے میں بھی آپ نے واقفیت حاصل کی۔
6. انھیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ تشبیہوں اور استعاروں سے شعری حسن میں اضافہ کرنا انھیں خوب آتا تھا۔ ان باتوں سے بھی واقفیت ہوئی۔
7. ان کے شعری مجموعوں سے واقفیت ہوئی۔

## 12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. جوش نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی؟
2. جوش ملیح آبادی کے اسلوب کی خصوصیات بتائیے؟
3. جوش کے چھ شعری مجموعوں کے نام لکھئے؟
4. نظم ''بدلی کا چاند'' کے کسی دو شعر کی تشریح کیجیے؟
5. جوش ملیح آبادی کی خودنوست کا کیا نام ہے؟

## 12.6 فرہنگ

| | | |
|---|---|---|
| خورشید | = | سورج، آفتاب اور شمس بھی کہتے ہیں |
| ظلمت | = | تاریکی، اندھیرا |
| نشان | = | جھنڈا، آثار |
| مہتاب | = | چاند، قمر بھی کہتے ہیں |
| صباحت | = | گوراپن خوبصورتی |
| جبیں | = | پیشانی |
| دریچے | = | کھڑکی، چھوٹا دروازہ |
| آسمان | = | گردوں |
| سفینے | = | کشتی |
| گرداب | = | بھنور |
| غرفہ | = | کھڑکی |
| کہسار | = | پہاڑ |
| چلمن | = | پردہ |
| تبسم | = | مسکراہٹ |
| تجلّی | = | روشنی |

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

| | | |
|---|---|---|
| ضیا | = | روشنی |
| کاوش | = | جدوجہد |

## 12.7 سوالوں کے جوابات

1. جوش نے حسبِ دستور ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ انھوں نے ماسٹر گومتی پرساد سے انگریزی سیکھی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ سیتاپور، لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرہ گئے۔ اسی دوران 1916 میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملیح آباد واپس چلے آئے۔

2. جوش ملیح آبادی کے اسلوب میں مقفّیٰ اور مسجع عبارت کا ملمع چڑھا ہوا ہے اور اپنی عبارت میں بے دریغ پر تکلف الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اُردو ادب میں چار ایسے شاعر و ادیب ہیں جن کے یہاں سرمایہ الفاظ کی فراوانی ہے نظیر، سودا، انیس اور جوش ملیح آبادی۔

3. روحِ ادب، شعلہ وشبنم، نقش ونگار، سنبل وسلاسل، فکر ونشاط اور مسموم وصبا۔

خورشید، وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب، وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

4. جوش نے اپنی نظموں کے ذریعے جہاں ایک طرف ملک اور قوم کو بیدار کیا ہے وہیں انھوں نے انسانی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سورج کے ڈوبتے ہی تاریکی چھاگئی مگر اس اندھیرے کو دور کرنے کے لیے چاند نکل آیا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ چاندنی نہیں بلکہ آسمانی سے چاندی کے ورق برس رہے ہیں۔ میدان، زمین اور پہاڑ چاند کی وجہ سے سانولے ہوگئے ہیں اور یہ سانولا پن ان کی خوبصورتی کا سبب ہیں۔ ابھی پورے طور پر چاند بادلوں سے باہر نہیں نکلا ہے، بلکہ وہ صرف اپنی پیشانی بادلوں سے نکالا ہے۔

## 12.8 کتب برائے مطالعہ

1. انتخاب کلیات جوش = ڈاکٹر فضل امام
2. جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن = ظفر محمود
3. جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ = ڈاکٹر عقیل احمد
4. جوش ملیح آبادی انسان الاشاعر = سیّد احتشام حسین
5. یادوں کی برات = جوش ملیح آبادی

# اکائی نمبر 13 فیض احمد فیض کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ

ساخت


13.1 اغراض و مقاصد

13.2 تمہید

13.3 فیض احمد فیض کی شاعری

13.3.1 فیض احمد فیض کا تعارف

13.3.2 فیض احمد فیض کی شعری خصوصیات

13.3.3 نظم ''تنہائی'' کی تشریح

13.4 آپ نے کیا سیکھا

13.5 اپنا امتحان خود لیجیے

13.6 فرہنگ

13.7 سوالوں کے جوابات

13.8 کتب برائے مطالعہ


## 13.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے

- فیض احمد فیض کے حالات زندگی اور ادبی پس منظر سے واقف کرانا۔
- فیض احمد فیض کی شاعری کی فنی خصوصیات سے متعارف کرانا۔
- فیض احمد فیض کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کرنا۔
- فیض احمد فیض کا اپنے ہم عصروں میں کیا مقام ہے۔
- فیض احمد فیض کی شاعری کے موضوعات سے متعلق جانکاری حاصل کرنا۔

## 13.2 تمہید

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں رومانیت کی لہریں اردو شاعری کی رگ و پہ میں سرایت کر چکی تھیں۔ جوش، اختر شیرانی اور احسان دانش جیسے شاعر رومانیت کی تعمیر میں کوشاں تھے۔ نظم نگاری کے میدان میں اختر الایمان ن۔م۔ راشد اور میرا جی اپنی انفرادیت کا لوہا منوا رہے تھے۔ اس دور کی غزلیں داغ دہلوی کے جادوئی اثر سے مکمل طور پر نجات نہیں حاصل کر سکی تھیں تاہم حسرت موہانی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، اقبال، سیماب اکبرآبادی اور جوش ملیح آبادی کے زیر اثر لکھی جا رہی تھیں۔ حسرت، فانی، جگر اور یگانہ روایت یا کلاسیکیت کی بازیافت کی طرف

پوری طور پر منہمک تھے، سیماب اور اقبال تو کلاسیکیت کی طرف متوجہ تھے۔ فیض کی غزلیں اور نظمیں اس روایت میں ایک طاقت ور عنصر کی شکل میں داخل ہوئیں اور بے پناہ وسعت دی۔ فیض کا اضافہ یہ ہے کہ انھوں نے روایتی سرمایہ الفاظ کو نئے اور وسیع تر معنوں میں استعمال کیا۔

## 13.3 فیض احمد فیض کی شاعری

### 13.3.1 فیض احمد فیض کا تعارف

فیض احمد خاں فیض 13 فروری 1911 کو سیالکوٹ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام سلطان فاطمہ تھا۔ ان کے والد سلطان محمد خان سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹر اور ایک علم دوست آدمی تھے۔ سلطان محمد خان سوانح ''امیر عبد الرحمٰن'' کے مصنف تھے۔ اس طرح، فیض کو علم و ادب سے شغف ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے ابتدائی، مذہبی تعلیم مولوی محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد 1921 میں اسکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ انھوں نے میٹرک اور ایف اے کا امتحان مرے سکول (Murray School) سیالکوٹ سے پاس کیا۔ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران، انھوں نے فارسی اور عربی زبان بھی سیکھی۔ ان کے فہرست اساتذہ میں میر مولوی شمس الحق بھی شامل تھے، جو علامہ اقبال کے بھی استاد تھے۔ 1928 میں انھوں نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے عربی میں بی اے، آنرز اور 1932 میں وہیں سے ایم اے، انگلش کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں 1934 اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں بھی ایم اے کیا اور عملی و ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ اسی دوران یعنی ۱۹۳۰ء میں ایک انگریز خاتون ایلس سے شادی کر لی۔

فیض نے ایم اے او کالج امرتسر میں بحیثیت لیکچرر، عربی سے ملازمت کی ابتدا کی، پھر ہیلے کالج لاہور (Hailey College) میں منتقل ہو گئے۔ 1942 میں فوج میں کیپٹن کی حیثیت سے محکمہ تعلقات عامہ (دہلی) میں شمولیت اختیار کی۔ میجر اور پھر لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک ترقی پانے کے بعد 1947 یعنی تقسیم ہند کے بعد فوج سے مستعفی ہو کر واپس لاہور چلے گئے۔ اور 1959 میں پاکستان آرٹس کونسل (لندن) میں سیکرٹری کی کرسی سنبھالی اور 1962 تک وہیں پر کام کیا۔ 1964 میں لندن سے واپسی پر عبداللہ ہارون کالج کراچی میں پرنسپل کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

فوج اور سرکاری ملازمت سے وابستگی کے علاوہ فیض زبان و ادب سے بھی مسلسل وابستہ رہے۔ 1947 سے 1985 کے دوران انھوں نے پاکستان ٹائمز، اردو روزنامہ: امروز، مہنامہ: ادب لطیف، ہفتہ روزہ اخبار: لیل و نہار کی ادارت کی۔ بعد میں بیک وقت ماسکو، لندن اور بیروت سے جاری ہونے والے اخبار لوٹس (Lotus) کی بھی ادارت کی۔ فوجی و سرکاری ملازمت اور صحافتی و ادارتی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتے ہوئے انھوں نے چھ مجموعے بھی ترتیب دیئے۔ ان کے مجموعوں کے نام ہیں: نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہہ سنگ، میرے دل میرے مسافر اور سرِ وادی سینا۔

9 مارچ 1951 میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے تختہ پلٹنے کی سازش (راولپنڈی

سازش کیس ) میں معاونت کے الزام میں حکومت وقت نے انہیں گرفتار کر لیا۔اور فیض نے چار سال سرگودھا، ساھیوال، حیدرآباد اور کراچی کی جیل میں گزارے۔ 2 اپریل 1955 کو رہائی نصیب ہوئی۔ زنداں نامہ کی بیشتر نظمیں اسی عرصہ میں لکھی گئیں۔ راولپنڈی کیس کے علاوہ 1958 میں بھی ان کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا۔ تاہم وہ تمام عمر شعر و ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے کوشاں رہے۔ جس کے لیے انھیں لینن پیس پرائز سے نوازا گیا نیز وفات سے قبل 1984 میں نوبل پیس پرائز کے لیے ان کا نام تجویز کیا گیا۔ بالآخر 1984 میں اردو شعر و ادب کی یہ شمع فروزاں گل ہوگئی۔

## سیاسی پس منظر

فیض نے انتشار اور انقلاب کے عہد میں آنکھیں کھولیں۔ بین الاقوامی سطح پر ۱۹۱۷ کا انقلاب روس، ایک ایسا انقلاب تھا جس نے ساری دنیا کو متاثر کیا۔ اس نقلاب کی وجہ سے دنیا کے کئی ممالک میں اشتراکی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس تاریخی واقعے اور اشتراکی نظامِ حکومت نے فیض کو براہ راست متاثر کیا۔ اس کے علاوہ 1939 کی دوسری بڑی جنگ اور ایشیائی ممالک بالخصوس ہندوستان کی تحریک آزادی نے بھی فیض جیسے، ایشیائی نوجوانوں میں بیداری کی روح پھونک دی تھی۔ دراصل جنگ کے زمانہ میں ہندوستان اور مغربی ممالک نظریاتی اور عملی، دونوں اعتبار سے بہت قریب آ گئے۔ ان نوجوانوں نے شدت کے ساتھ اس بات کو محسوس کیا کہ 1930 کے بعد یوروپ میں بڑھتی ہوئی فسطائیت کہیں پوری دنیا کو اپنے قبضے میں نہ لے لے، اس سے نبرد آزما ہونے نیز سوشلزم کی حمایت اور فاشزم کی مخالفت کے لیے لندن میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، جس کی بازگشت 1936 میں ترقی پسند تحریک کی شکل میں ہندوستان میں بھی سنائی دی، جس کو ادب میں ترقی پسند تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

فیض نے جب علمی زندگی کا آغاز کیا تو امرتسر میں صاحبزادہ محمود الظفر اور اُن کی اہلیہ رشیدہ جہاں کے زیر اثر مارکسزم کا مطالعہ کیا بعدازاں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز عمل میں آیا تو فیض اُسکے بانی اراکین میں شامل تھے۔ فیض نے ہزاروں سختیوں کو سہنے اور دار و رسن کی منزلوں سے گزرنے کے باوجود نہ تو اپنے نظریات میں لچک پیدا کی اور نہ ہی روگردانی کی۔ اُس وقت جب ترقی پسندوں پر اُن کے گھروں کے دروازے مقفل اور جیلوں کے دروازے وا کر دیے تب بھی فیض اس تحریک سے وابستہ رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض وفاداری بشرط استواری کے قائل تھے۔ دراصل فیض غیر طبقاتی نظام کے قائل تھے۔ وہ معاشرے میں ایسا انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے جو موجودہ استحصالی نظام کو بالکل تبدیل کردے۔ ان کی بیشتر شاعری کا مرکز و محور مذکورہ نظام ہے۔ لیکن قاری قرات متن کے حوالے سے آزاد ہے کہ کلام فیض کو فیض کے نظریات و حیات کے آئینے میں پڑھے یا پھر اردو شاعری کے کلاسیکی حوالوں سے کلام فیض کی بازیافت کرے۔

## 13.3.2 فیض احمد فیض کی شعری خصوصیات

فیض نے جب شعور سنبھالا تو رومانیت کی لہر اردو شعر و ادب کو شرابور کر رہی تھی۔ جوش، اختر شیرانی اور احسان دانش جیسے شعرا ایک نوع کی رومانی جنت کی تعمیر میں کوشاں تھے۔ نظم نگاری کے میدان میں اختر الایمان،

یادداشتیں

ن۔م۔راشد، اور میراجی اپنی انفرادیت کا علم بلند کرنے میں مصروف تھے۔گرچہ اس دور کی غزلیں داغ دہلوی کے جادوئی اثر سے مکمل طور پر نجات نہیں حاصل کر سکیں تھیں، تاہم کائنات غزل، حسرت موہانی، فانی بدایونی، جگر مرادابادی، جلیل مانک پوری، یگانہ، اقبال، سیماب اکبرابادی اور جوش ملیح آبادی کے زیراثر تھی۔ مذکورہ تمام شعرا کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ یا پہلا گروپ: حسرت موہانی، فانی بدایونی، جگر مرادابادی اور یگانہ، روایت یا کلاسیکیت کی بازیافت کی طرف پورے طور پر منہمک تھا جب کہ دوسرا حصہ یا گروپ: اقبال، سیماب اور جوش نو کلاسیکیت کی طرف متوجہ تھا۔دوسرے قبیل کے شعرا کے اسلوب میں نو کلاسیکی شعرا کے مانند کلاسیکیت اور نو کلاسیکیت کے مابین کی آویزش: تراکیب سازی، تراش خراش، تخلیقی برتاؤ وغیرہ کی سطح پر واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے ۔لیکن فیض، حسرت موہانی کی طرح روایت کی قوت اور تخلیقی اظہار میں اس کے وسیع تر امکانات سے بخوبی آگاہ نظر آتے ہیں۔

فیض کی غزلوں اور نظموں میں روایت اور اس کی پاسداری ایک طاقت ور عنصر کی طرح شامل ہے۔انھوں نے فارسی اور اردو شاعری کی طویل روایات سے اپنا رشتہ نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انہیں روایات میں بے پناہ وسعت پیدا کر دی ۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں زبان کا خوبصورت استعمال، تراکیب سازی، روایتی لفظوں کا استعمال نت نئی معنویت کے ساتھ، قدم قدم پر دکھائی دیتا ہے۔اردو شاعری کی روایت میں قفس، زنداں، قتل گاہ، پیرہن، آتش گل، کج کلاہی، سنت منصور وقیس، صید، صیاد، دار و رسن، سردار، اغیار، مرغان قفس، مرغان اسیر، رقیب، زخم، نقش پا، اور جادہ و منزل وغیرہ جیسے الفاظ بکثرت ملتے ہیں، مگر فیض کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ انھوں نے مذکورہ روایتی سرمایہ الفاظ کو نئے اور وسیع تر معنوں میں استعمال کیا، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ فیض نے روایت کی بازیافت کے عمل میں ایک نوع کی تخلیقی شان پیدا کر دی۔

فیض اپنے کلام سے زاہدِ خشک اور ناصح ہونے کا تصور نہیں پیش کرتے بلکہ پھول، قلم، تلوار کے ساتھ ساتھ چشم و ابرو، لب و رخسار کی باتیں بھی کرتے ہیں ۔درحقیقت ان کی اُفتادِ طبع رومانی ہے۔ان کے سینے میں پیار بھرا دل دھڑکتا ہے۔اسی وجہ سے ان کے کلام میں لطافت اور نزاکت کی روحانی فضا اور خلوص کا احساس ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ شاعری میں جذبات کی ترجمانی کے لیے صدق و خلوص بنیادی عناصر ہیں۔صرف احساسات، محسوسات اور جذبات کے بیان کا نام ہی شاعری نہیں ہے۔ بلکہ خلوص ہی ایک ایسا عنصر ہے جو احساسات و جذبات پر مہرِ صداقت ثبت کرتا ہے۔ان کی بیشتر شاعری میں اسی خلوص کا احساس ہوتا ہے ۔وہ بڑے ہی خلوص کے ساتھ تصورِ جاناں پر سب کچھ نچھاور کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی و رخسار و ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹادی ہم نے

اور جمالِ محبوب کو دیکھ کر اپنے محسوسات کو ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں:

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی

نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے تیرے بدن کی سی

نیز کسی حسن پرست کے مانند نیم وا آنکھوں میں کاجل کی لکیر فیض کے دل پر بڑا گہرا وار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

آج وہ حسن و دلدار کی وہی دھج ہوئی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا اُبھار
صندلیں ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

تاہم واضح رہے کہ وہ خالص رومانوی شاعر نہیں ہیں۔ ان کی رومانیت حقیقت سے تجاوز نہیں کرتی۔ وہ حسن پرست بھی ایک خاص حد تک ہیں جس حد تک انہیں انقلابی کہا جا سکتا ہے۔

فیض کی بیشتر شاعری کا مرکز ومحور انقلاب یا سوشلزم کا قیام ہے۔ ان معنوں میں ان کو انقلابی قرار دیا جا سکتا ہے۔ سوشلزم سے وابستگی اور آزادانہ اظہارِ خیال کی حمایت کی وجہ سے انہیں اپنی زندگی کے بہترین ماہ وسال قید میں گزارنے پڑے لیکن فیض کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی اور نہ ہی ان کی فکر پر پہرے نہ لگائے جا سکے چنانچہ گرفتاری کے دوران بھی فیض نے اپنے انقلابی خیالات کا اظہار جاری رکھا۔

اے خاک نشینوں اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

انقلاب کا تصور قید و بند، دار ورسن اور کشت وخون سے ہو کر گزرتا ہے۔ لہٰذا زنداں میں فیض کے دل و دماغ پر اس وقت قیامت گزر گئی جب انہیں ''غدارِ وطن'' قرار دیا گیا اور وطن دشمنی کے الزامات لگائے گئے۔ ان ہی کے لفظوں میں:

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں ، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ، سرِ گوشہ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم ، برسرِ دربار

دوسری جانب فیض اپنے دیس اور اس کے باشندوں کی خستہ حالی، قوم کی عزت و ناموس کی آرزانی، لوگوں کی ناداری، جہالت، بھوک اور غم واندوہ کو دیکھ کر تڑپتے ہیں مگر وطن عزیز بے پناہ سے محبت کا احساس کم ہونے کے بجائے فزوں تر ہو جاتا ہے۔ ان ہی کے لفظوں میں:

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

THE PEOPLE'S UNIVERSITY

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

فیض ایک طرف انقلاب کے نعرے بلند کرتے ہیں تو دوسری طرف محبت کے گیت الاپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی انقلابی روح انہیں انقلاب کا درس دینے پر مجبور کرتی ہے ان کے اشعار میں رومان اور انقلاب کی ہم آہنگی کی وجہ سے غنائیت اور شگفتگی کے علاوہ رنگینی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی سچی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔اسی لیے ان کے اشعار میں رنگینی حسن اور نزاکتِ خیال کا ایک انوکھا اور منفرد انداز نظر آتا ہے:

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام
بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح ، دوپہر کبھی شام
کہیں جو قامت زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن سرو صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساطِ غزل جب ڈبو لیے دل نے
تمہارے سایہ رخسار ولب میں ساغر وجام

فیض کی شاعری کا ایک اہم موضوع وطن سے محبت بھی ہے۔انہیں اپنی مٹی سے بے پناہ پیار رتھا۔یہ مٹی انہیں تصور جاناں کی طرح عزیز تھی۔ بسا اوقات ان کی شاعری میں محبوبہ اور وطن میں فرق کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی:

"دراصل فیض کو اپنے وطن سے بے حد محبت ہے۔ وہ اپنے وطن سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح کوئی مرد کسی عورت سے کرتا ہے۔

چنانچہ اپنی مشہور نظم "دو عشق" میں ایک طرف وہ اپنی محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دل زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردن مہتاب میں باہیں

دوسری جانب وطن عزیز سے محبت کا اقرار کرتے ہوئے، کہتے ہیں:

چاہا اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہیں یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

مختصراً لیلائے وطن سے محبت فیض کی نظموں کا ایک مستقل موضوع ہے۔قید و بند کی صعوبتوں نے اس محبت کو اور بھی جلا بخشی۔جیل: جہاں انسان سے اس کی مرضی چھین لی جاتی ہے، فیض کے لیے سوہان روح تھی وہ جیل کی اندھیری کوٹھری میں وطن کا تصور کچھ اس طرح سے کرتے ہیں۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل نے سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

1947 کی آزادی سے قبل فیض نے بھی آزادی کے خوبصورت خواب دیکھے تھے۔اور تصور میں وطن عزیز اور اس کی آزادی ایک جنت کی صورت میں آباد تھا مگر جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو حالات خواب و خیال کی دنیا سے یکسر مختلف تھے۔یہ آزادی اپنے ساتھ خون کے چھینٹے اور نفرت کا کالا دھواں ساتھ لے کر آئی۔اس آزادی سے بیشتر اہل دانش اور حساس لوگوں کو شکایت تھی۔فیض کو بھی یہ آزادی راس نہیں آئی اور انھوں نے اس آزادی کو ادھوری آزادی قرار دیا نیز اس کو ''شب گزیدہ سحر'' اور ''داغ داغ اجالا'' سے تعبیر کیا۔ان کے لفظوں میں:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

مگر اس کے باوجود فیض مایوس ہو کر نہیں بیٹھے بلکہ ابنائے وطن کو جدوجہد جاری رکھنے اور آگے بڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر غزل کو بہت نقصان پہنچا لیکن فیض نے ترقی پسند نظریات کے اظہار کے لیے بھی غزل کا پیرایہ اختیار کیا اور سیاسی مزاحمتی نظمیں لکھنے کے بجائے غزلوں کو ترجیح دی۔کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ سیاسی اور مزاحمتی ادب کی عمر بہت کوتاہ ہوتی ہے۔اس لیے فیض کو رومان اور انقلاب کا سنگم کہنا بے جا نہ ہوگا انھوں نے بیک وقت محبت اور انقلاب کے ترانے گائے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کے اکثر کلام میں محبوب، وطن اور انقلاب آپس میں ہم آہنگ اور غمِ جاناں اور غم دوراں ایک ہی پیکر میں یکجا ہو گئے ہیں۔ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکیت اور رومانیت کو شعری قالب میں ڈھال کر اردو شاعری کو ایک منفرد اسلوب اور لہجہ عطا کر دیا۔درج ذیل اشعار پر غور کریں فیض نے کلاسیکی الفاظ اور تشبیہات و استعارات کو اس طرح سے استعمال کیا ہے جیسے کوئی اپنے محبوب سے اظہار محبت کر رہا ہو:

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض کا عندیہ تھا کہ جب رومان و انقلاب ایک شاعر کے فن اور ذات میں ڈھل جاتے ہیں تو ترقی پسند شاعری پیدا ہوتی ہے۔ وہ سستی جذباتیت اور نعرہ بازی کے خلاف تھے۔ وہ صرف انقلاب کا نعرہ بلند کر کے کشت و خون کی دعوت دیتے نظر نہیں آتے بلکہ وہ نرم اور کومل الفاظ میں ہمیں انقلاب کے راستے سے روشناس کراتے ہیں۔ چنانچہ فیض اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''میزان'' میں لکھتے ہیں کہ:

''انقلابی شاعر پر حسن و عشق یا مے و جام حرام نہیں، اور اُس پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ انقلابی مضامین کے علاوہ دوسرے تجربات اور دوسری وارداتوں کا ذکر نہ کرے۔''

فیض پر یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ کے مطالبات انسان کے جسم سے متعلق ہیں۔ اُسکی روح کی طلب روٹی کپڑے کے بجائے روحانی تسکین کی متلاشی ہے۔ اور یہ تسکین اُنہیں رومان ہی میں نظر آئی۔لیکن اُن کے ہاں اختر کی سی سطحی رومانیت نہیں بلکہ اس رومانیت میں حقیقت کا پرتو بھی موجود ہے۔ بقول صفدر میر:

''حقیقت یہ ہے کہ اس کی شاعری میں محبت اور انقلاب کو باہم مربوط کر دیا گیا ہے اور یہ صفت موجودہ دور میں کسی اور شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی''

فیض نے اپنے ایک مضمون'' شاعری کی جمالیاتی قدریں'' میں حسن اور غنائیت سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں افادی فعل بھی ہے چنانچہ ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت یا رنگینی پیدا ہو جس کا حسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے جس سے تزکیہ نفس ہو جو ہماری روح کو مترنم کرے جس کی لو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جلا حاصل ہو صرف حسین ہی نہیں مفید بھی ہے اس وجہ سے جملہ غنائیہ ادب بلکہ تمام اچھا آرٹ ہمارے لیے قابل قدر ہے۔''

اس اقتباس سے ان کی طبعی اور ذہنی فکری صلاحیت کے علاوہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو حسین بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں چھوٹی اور مترنم بحروں کو استعمال کر کے اپنے نظریہ حسن، افادیت اور غنائیت کو عملی طور پر ثابت بھی کر دکھایا۔

فیض کا مخصوص لب ولہجہ اور اسلوب ہی وہ جادو ہے جو قاری اور سامع کو اپنا اسیر کر لیتا ہے۔اس اسلوب کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ جدید ذہن اس کو جدید حوالے سے لیتا ہے اور قدیم ذہن اس اسلوب میں کلاسیکی رکھ رکھاؤ اور شیرینی تلاش کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض بیک وقت، ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں پر محیط نظر آتے ہیں۔دیگر ترقی پسند شاعروں کے مانند انھوں نے براہ راست طریقہ اظہار کے بجائے بالواسطہ طریقۂ اظہار کو اپنایا۔اس طریقۂ اظہار نے ان کی شاعری کو منفرد اور دیرپا بنا دیا۔ان کے اسلوب کے متعلق فضیل جعفری رقمطراز ہیں:

''فیض کی شاعری کو عظیم اور اس درجہ مقبول بنانے میں ان کے منفرد اسلوب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔''

فیض کی زبان سادہ اور لفاظی ومبالغہ سے مبرا نظر آتی ہے۔ یہ ایک اہم خصوصیت ہے جو انھیں دیگر معاصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ ن۔م۔ راشد بلا تکلف فارسی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ جوش و مجاز بھی عربی فارسی کے ثقیل الفاظ سے دامن نہیں بچا سکے۔ لیکن فیض جو بات کہتے ہیں سیدھے سادے الفاظ میں کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بلا کا درد، تاثیر، متوازن نشتریت اور سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے۔

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل باہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

## خود کلامی

فیض کی اکثر نظمیں خود کلامی کی مثالیں ہیں۔ اس طرزِ شاعری میں شاعر خود سے باتیں کرتا ہے۔ کسی دوسرے کردار کی مداخلت کے بجائے شاعر کی ذات ہی دو یا تین کرداروں میں منقسم ہو جاتی ہے نیز نظم یا شاعری میں موجود، صیغہ واحد حاضر یا جمع حاضر کا مخاطب شاعر کی کئی حصوں میں منقسم کوئی نہ کوئی کردار ہوتا ہے۔ یہ صنفِ شاعری انگریزی میں بہت مقبول ہے۔ فیض کی چند نظمیں اس سلسلہ میں قابل توجہ ہیں۔ کچھ اور جدید شعرا نے بھی اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن فیض زیادہ کامیاب اور قابل تحسین نظر آتے ہیں۔

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا ''جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہ جام اتر آئی ہے''

کلاسیکی شعرا کے مانند فیض نے اپنے خیالات کی بہتر ترسیل کے لیے نت نئے استعارے اور نادر تشبیہوں کے علاوہ دیگر صنائع بدائع کا بھی سہارا لیا ہے۔ لیکن ان کی صنعتیں بالخصوص تشبیہات اور استعارات بظاہر قدیم ہوتے ہوئے بھی اپنے قاری کو ایک نئے جہان معانی سے روشناس کراتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے ہاتھ کو بطور استعارہ بہت ہی خوبصورت طریقے سے استعمال کیا ہے۔

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک اس نطق میں طاقت ہے جب تک
تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کا تھا جس نے آہ نہ کی

اور تشبیہات کی جدت ملاحظہ ہو:

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

### 13.3.3 نظم 'تنہائی' کی تشریح

#### تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک رہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

#### تشریح

(نوٹ: یہ ایک مکالماتی نظم ہے اور مکالمے کی وجہ سے اس نظم میں ڈرامائیت پیدا ہوگئی ہے۔ اگر نثر کے ساتھ مکالمہ ادا کرنے والے کرداروں کے نام اور تصور کی مدد سے کرداروں کی حرکات وسکنات کو بھی قوسین میں لکھ دیا جائے تو تفہیم میں بہت ہی آسانی پیدا ہو جائے گی۔ ذیل میں نثر کو ترچھے لکھا ہے)

شاعر: پھر کوئی آیا دلِ زار! (لفظ ''پھر'' تکرار وتسلسل اور امکان کے معنی بھی رکھتا ہے۔ اس طرح سے یہ نظم امکان سے شروع ہو رہی ہے کہ شاید وہ آسکتا ہے۔ یا شاید ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ نہ آئے)

دلِ زار: نہیں کوئی نہیں۔ (لیکن دل زار نے منفی جواب دے کر ''اثبات'' کے امکان کو کچھ اور کم کر دیا۔)

(شاعر: بے صدا، استفہامیہ اشارے کے ذریعہ پھر پوچھتا ہے کہ ''پھر کوئی آیا''۔ شاید پھر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی یا شدت انتظار کی وجہ سے کان بجنے لگے ہوں)

دلِ زار: راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا۔ یعنی دل زار پہلے سے ہی مایوسی کا شکار ہو چکا ہے اور اٹھ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ: کوئی مسافر ہوگا، جو ہمارے پاس آنے کے بجائے کہیں اور چلا جائے گا۔

(شاعر مایوس ہو کر آسمان کی جانب دیکھتا ہے۔ غالباً یہ ایک فطری عمل ہے کہ حالت یاس میں انسان گہری سانسیں لیتا ہے، ہونٹ سکیڑتا ہے یا پھر لامحالا اس کی آنکھیں آسمان کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ لیکن اوپر دیکھنے کا عمل بہت ہی قلیل عرصے پر محیط ہوتا ہے۔ اور بالآخر شدت یاس سے وہ اپنا سر جھکا لیتا ہے یا پھر زانو میں دے لیتا۔ سر

اوپر کی جانب اٹھانے سے لے کر زانو پر رکھنے کے درمیان اس کی نگاہیں پہلے آسمان، پھر آنکھوں کے متوازی اور سب سے آخر میں قدموں کی جانب بالترتیب مرکوز ہوتی ہیں۔ یہاں فیض نے اس نفسیاتی عمل اور ترتیب کا بطور خاص خیال رکھا ہے۔)

شاعر:(آسمان کی جانب دیکھ کر) ڈھل چکی رات، تاروں کا غبار بکھرنے لگا۔ یعنی صبح نمودار ہونے والی ہے۔(شاعر جس کا انتظار کر رہا ہے شاید اس کو رات میں ہی آنا۔لیکن اب اس کے آنے کے امکانات رفتہ رفتہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔)

(شاعر کی نگاہیں اپنی آنکھوں کے متوازی منظر پر پڑتی ہے اور وہ کہتا ہے) ایوانوں میں خوابیدہ چراغ لڑکھڑانے لگے۔یعنی محلوں میں چراغ ایک ایک کر کے بجھنے لگے ہیں۔ واضح رہے کہ صبح کے نمودار ہونے کے ساتھ ساتھ چراغوں کی روشنی ماند پڑنے لگتی ہے۔ساتھ ہی ایسا بھی ممکن ہے کہ صبح کے قریب چراغوں کا تیل ختم ہونے لگتا ہے اور وہ خوابیدہ یعنی سوتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ بہر حال یہاں مذکورہ دونوں قرینے موجود ہیں۔

(بتدریج بڑھتی ہوئی مایوسی اور شدت یاس سے سر کو زانو پر رکھنے سے پہلے اس کی نگاہ زمین یا راستے پر پڑتی ہے اور شاعر کہتا ہے کہ) راستہ تک تک کے ہر اک رہگزار سو گئی۔ یعنی نمود صبح سے قبل نہ تو راستوں پر لوگوں کی چہل پہل ہے اور نہ رات میں روشن کی گئی قندیلوں کی بہار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ محبوب یا پسندیدہ نظام کا انتظار کرتے کرتے راستے بھی تھک کر سو گئے ہیں۔

(شاعر راستوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہتا ہے کہ) اجنبی خاک نے قدموں کے سراغ دھندلا دئے۔ یعنی اس صبح کے نمودار ہونے سے قبل محبوب کے قدموں کے نشانات ان راستوں پر موجود تھے لیکن اب، اس راستے سے اتنے لوگ گزر چکے ہیں اس محبوب کے نشانات بھی نہیں رہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے آنے کے امکانات بتدریج ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

(مایوسی میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے اور شاعر کہتا ہے کہ اگر اس کے آنے کے امکانات اگر ختم ہوتے جا رہے ہیں تو) گل کرو شمعیں، مئے و مینا و ایاغ بڑھا دو۔یعنی چراغوں کو بجھا کر شراب اور مدہوشی میں خود کو گم کر لو۔ لیکن ایک مسئلہ ہے کہ شراب پینے والوں کا تصور ہے کہ شراب کو پانچوں حواس سے محسوس کرنے پر اس کا اصل لطف آتا ہے۔یعنی قوت شامہ سے سونگھ کر، قوت باصرہ سے شراب کی رنگت کو دیکھ کر: غالبا اسی وجہ سے مئے نوش شیشے کا گلاس استعمال کرتے ہیں۔اور قوت لامسہ سے چھو کر یعنی شراب اس طرح پی جائے کہ ہونٹ تر ہو جائیں اور ہونٹ سے چھو کر اس کو محسوس کیا جا سکے۔اور حس ذائقہ تو بہر حال شراب نوشی کا حصہ ہے۔ صرف ایک حس باقی رہ جاتی ہے۔ وہ ہے حس سامعہ یعنی سننے کی صلاحیت۔جسکو مئے نوشی میں شامل کرنے کے لیے گلاس سے گلاس ٹکرائے جاتے ہیں اور چیرس (CHEERS) کہا جاتا ہے۔لیکن، یہاں تو شاعر ایک حس، حس باصرہ کو زائل کرنے کی بات کہہ رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ شاعر کے نزدیک مقصودِ مئے نوشی بغرض نشاط نہیں ہے بلکہ وہ تو بدریج بڑھتی ہوئی مایوسی سے نجات چاہتا ہے۔ اس لیے اگلے مصرعے میں وہ تمام حواس کو زائل کرنے یعنی سو جانے کی بات کر رہا ہے۔

(اگر ایسا ہے کہ اس کے آنے کے تمام امکانات ختم ہو چکے ہیں تو) اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو۔

یعنی سو جاؤ۔ شراب کے نشے میں پناہ لے کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤ۔ (پہلے مصرعہ سے شروع ہونے والے" امکان " کے سفر کا آخری مصرعہ تک پہنچتے پہنچتے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور شاعر کوئی نہیں کوئی، نہیں کی تکرار سے مکمل مایوسی کی ترسیل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ) اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔

## 13.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

1. فیض احمد فیض سے متعارف ہوئے۔
2. فیض کے عہد اور ان کے ہم عصروں کے بارے میں معلومات حاصل کیا۔
3. فیض کی شاعری کے فنی محاسن سے آگاہ ہوئے۔
4. فیض کے اسلوب کی خصوصیات سے روشناس ہوئے۔
5. فیض کی نظم 'تنہائی' کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعے کو سمجھا۔

## 13.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. فیض کے عہد کے رجحانات بتائیے۔
2. فیض کے اسلوب کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. فیض کے شعری مجموعوں کے نام بتائیے۔
4. فیض کی شاعری کے اہم موضوعات کیا ہیں۔
5. فیض نے کن کن رسالوں اور اخباروں کی ادارت کی۔

## 13.6 فرہنگ

| | | |
|---|---|---|
| دلِ زار | = | جلتے ہوئے دل |
| راہرو | = | مسافر |
| غبار | = | گرد، دھول |
| ایوانوں | = | محل |
| خوابیدہ | = | سوئے ہوئے |
| رہگزار | = | راستہ، شارع عام، سڑک |
| سراغ | = | کھوج، پاؤں کا نشان، نقش قدم |
| گل کرنا | = | بجھانا |

| | | |
|---|---|---|
| مئے | = | شراب |
| مینا | = | شراب کی بوتل یا صراحی، خم شراب، بطِ شراب |
| ایاغ | = | پیالہ، جام |

## 13.7 سوالوں کے جوابات

1. فیض کے زمانے میں رومانیت کی لہر اردو شاعری کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ جوش اختر شیرانی اور احسان دانش جیسے شاعر رومانی جنّت کی تعمیر میں کوشاں تھے۔نظم نگاری میں اختر الایمان، ن۔م۔ راشد اور میراجی اپنی انفرادیت کا لوہا منوا رہے تھے۔حسرت، فانی، جگر اور یگانہ روایت یا کلاسیکیت کی بازیافت میں مصروف تھے اور اقبال، سیماب نو کلاسیکیت کی طرف متوجہ تھے۔فیض کی غزلیں اور نظمیں اس روایت میں ایک طاقت اور عنصر کی شکل میں داخل ہوئیں اور روایتی سرمایہ الفاظ کو نئے اور وسیع تر معنی دیے۔
2. فیض کا مخصوص لہجہ قاری اور سامع کو اپنا اسیر کر لیتا ہے۔ وہ جدید ذہن کو جدید حوالے سے دیکھتے ہیں اور کلاسیکی رچاؤ اور شیرینی کو اپنا محور۔ انھوں نے بالواسطہ طریقۂ اظہار اختیار کیا۔فیض کی زبان سادہ ہے جو توازن، قربت اور سنجیدگی کا احساس دلاتی ہے۔شاعر کی جمالیاتی قدروں میں وہ حسن اور غنایت کے قائل ہیں۔ ان کے اشعار ہی خود کلامی کا انداز ملتا ہے۔تشبیہ و استعارات میں ندرت ہے جس میں وہ نئے معنی سے روشناس کراتے ہیں۔ وہ بیک وقت رومانی، انقلابی، کلاسیکی اور جدید شاعر ہیں۔ ان کی شاعری رومان اور انقلاب کا سنگم ہے۔
3. فیض اور فیض کے شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں:

نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہہ سنگ، میرے دل میرے مسافر اور سرداری نیا، غبارِ ایام، یادشہرِ یاراں

4. فیض احمد فیض کی شاعری کے اہم موضوعات یہ ہیں:

رومان اور انقلاب، سوشلزم و اشتراکیت، وطن پرستی، انسان دوستی، جبر و استحصال کی مخالفت، آزادی وغیرہ۔

5. فیض نے پاکستان ٹائمز، اردو روزنامہ، امروز، ادب لطیف اور لیل و نہار (ہفت روزہ اخبار) اور ماسکو، لندن اور بیروت سے بیک وقت جاری ہونے والا اخبار لوٹس (Lotus) کی ادارت کی۔

## 13.8 کتب برائے مطالعہ

| | | |
|---|---|---|
| 1. | کلیاتِ فیض | فیض احمد فیض |
| 2. | روشنائی | سجاد ظہیر |
| 3. | اردو ادب کی تاریخ | سیدہ جعفر |

# اکائی نمبر 14 اسرار الحق مجاز کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ

## ساخت

14.1 اغراض و مقاصد
14.2 تمہید
14.3 اسرار الحق مجاز کی شاعری
14.3.1 اسرار الحق مجاز کا تعارف
14.3.2 اسرار الحق مجاز کی شعری خصوصیات
14.3.3 نظم ''آوارہ'' کی تشریح
14.4 آپ نے کیا سیکھا
14.5 اپنا امتحان خود لیجیے
14.6 فرہنگ
14.7 سوالوں کے جوابات
14.8 کتب برائے مطالعہ

## 14.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو اردو کے ایک مایہ ناز شاعر اسرار الحق مجاز لکھنوی کی شخصیت اور شاعری سے متعارف کرانا ہے جنھیں ان کی رومانی اور باغیانہ فکر کے سبب انگریزی شاعر کیٹس سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ مجاز اپنی کل 45 سالہ زندگی میں کیسے کیسے حالات و حوادث سے گزرتے رہے اور بحیثیت شاعر ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔

## 14.2 تمہید

اسرار الحق مجاز بارہ بنکی کے معروف قصبہ ردولی کے ایک متمول زمیندار گھرانے میں 19 اکتوبر 1911 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام چودھری سراج الحق تھا۔ ان کا لڑکپن بڑے لاڈ پیار میں گذرا۔ مجاز کی والدہ تیز، زمانہ شناس، شوقین مزاج اور تفریح پسند خاتون تھیں جس کا اثر مجاز کی شخصیت پر بھی پڑا۔ باپ کی طرف سے انھیں نیک نیتی، کم سخنی، حقیقت پسندی، اور طبیعت کی گہرائی ملی تو ماں کی طرف سے حسن پرستی، اور جذباتیت ان کے حصے میں آئی۔ ان کی طبیعت میں بچپن ہی سے ایک قسم کی معصومیت اور سادگی تھی جس کی وجہ سے وہ سب کو عزیز تھے۔ شوخ، شریر اور غیور ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین تھے اور پڑھائی میں ہوشیار۔ حساب میں بہت تیز تھے۔ جماعت میں ہمیشہ اچھے طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم ردولی کے ہی ایک مکتب میں ہوئی۔ پھر وہ

لکھنؤ آگئے، جہاں ان کے والد محکمہ رجسٹریشن میں ہیڈ کلرک تھے۔ امین آباد ہائی اسکول میں داخل ہوئے، میٹرک کا امتحان پاس کیا اور چونکہ ان کے والد کا تبادلہ آگرہ ہوگیا تھا، مجاز بھی آگرہ آگئے اور 1929 میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں انٹرمیڈیٹ میں داخل ہوگئے لیکن وہاں شعروشاعری کی محفلوں میں شرکت کی وجہ سے وہ تعلیم پر پورا وقت صرف نہ کرسکے اور فیل ہوگئے۔ وہاں سے علی گڑھ آگئے اور یہاں 1935 میں یونیورسٹی سے بی۔اے کیا اور ایم۔اے، اردو میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بنے۔ ابھی زیرتعلیم ہی تھے کہ، دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نکلنے والے میگزین۔ آواز میں سب ایڈیٹر ہوگئے۔ ایک سال ملازمت کرنے کے بعد سبک دوش ہوگئے۔ کچھ عرصہ پہلے شراب پینے کے سبب صحت خراب رہنے لگی تھی۔ بے حد نڈھال اور کمزور ہوگئے۔ عمر کے مختلف حصوں میں 3، 4 مرتبہ نروس بریک ڈاؤن کے شکار ہوئے۔ علاج معالجہ سے افاقہ ہوتا رہا لیکن شراب خوری کی عادت جو ان کے ذاتی مسائل، عشق و محبت میں مسلسل ناکامی اور مفلسی کے سبب روز افزوں ہوتی گئی۔ ان کے لیے سخت مہلک ثابت ہوئی وہ دہلی کی ایک لائبریری میں ملازم ہوگئے۔ صحت مسلسل خراب رہتی تھی۔ پھر بیمار پڑے، رانچی پاگل خانے میں داخل ہوئے، علاج سے ٹھیک ہوئے۔ پھر اپنے وطن ردولی چلے گئے لیکن ان کی عادتوں میں تبدیلی نہ ہوئی، صحت خراب ہوتی رہی اور بالآخر 5 دسمبر 1955 کو لکھنؤ میں ایک شراب خانے کی چھت پر مرے ہوئے پائے گئے۔ مجاز نے کئی معاشقے بھی کیے جن میں ناکام رہے اور تمام زندگی مجرّد گزار کر بہت جلد دنیا سے رخصت ہوگئے۔

## 14.3 اسرارالحق مجاز کی شاعری

### 14.3.1 اسرارالحق مجاز کا تعارف

مجاز نے جب آنکھ کھولی تو پورے ملک پر انگریزوں کی حکومت تھی اس جابرانہ حکومت کے خلاف پورے ملک میں تحریکیں بھی چل رہی تھیں۔ گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک سب سے موثر ہتھیار تھا جو عدم تشدد کے راستے آزادی ملک کی جدوجہد میں سرگرم تھا۔ اس تحریک میں ہندو مسلمان سب شریک تھے۔ البتہ انگریزوں نے بھی اپنی شرپسند حکمت عملی کے تحت ہندو مسلم منافرت کا ایسا ماحول تیار کردیا تھا کہ صدیوں سے چلا آرہا مشترکہ تہذیبی نظام ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ منافرت اور فرقہ وارانہ ذہنیت فروغ پارہی تھی۔ ملک میں غربت، افلاس، تنگ نظری، جہالت، بیماری اور جرائم بڑھتے جارہے تھے۔ ان حالات میں کانگریس کے رہنما پنڈت نہرو اپنی تقریروتحریر کے ذریعہ ملک کی خدمت اور اس کی تہذیبی تکثیریت کو باقی رکھنے کے لیے رات دن اپنے رفقا کے ساتھ محنت کررہے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ بہت جلد صورت حال بدل جائے گی اور ہم ایک آزاد ملک کے مالک ہوں گے۔ بہرحال یہ بات درست ثابت ہوئی۔ آزادی تو مل گئی لیکن اس کے ساتھ بہت سے نئے سیاسی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی اور اخلاقی مسائل پیدا ہوگئے جن پر ابھی تک قابو نہیں پایا جاسکا ہے۔ 1947 میں جب ملک آزاد ہوا اس وقت مجاز کی عمر 36 سال تھی، گرچہ ذاتی طور پر ان کے حالات خود بہت خراب تھے لیکن وہ آلام و مصائب سے بے خبر یقیناً نہیں تھے۔

آگرے میں تعلیم کے دوران ان کے جوہر کھلے جہاں انھیں معین احسن جذبی، میکش اکبرآبادی، اور آل احمد سرور

یادداشتیں

کی صحبتیں میسر آئیں جو کم و بیش ان کے ہم عمر تھے۔ تاہم ان کو جو شہرت و مقبولیت یہاں ملی۔ اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میں ملی، جہاں انھیں ایک وسیع ماحول ملا اور چند نہایت ذہین نوجوان دوست بھی میسر آئے جو ترقی پسند فکر و فلسفے سے بہت گہری ذہنی مناسبت رکھتے تھے، یعنی ڈاکٹر اشرف، اختر رائے پوری، سبط حسن، سجاد ظہیر، سردار جعفری وغیرہ ان سب کی رفاقتوں میں مجاز اشتراکی فکر، سرکشی اور کج کلاہی کے ایک نئے انقلابی تصور سے آشنا ہوئے اور ان کی نظموں میں ان خیالات کی گونج سنائی دینے لگی۔ 1935 میں وہ ملازمت کی تلاش میں امرتسر گئے جہاں ان کی ملاقات محمود الظفر اور رشید جہاں سے ہوئی۔

## 14.3.2 اسرار الحق مجاز کی شعری خصوصیات

مجاز نے شعر و سخن کی ابتدا تو بہت پہلے کر دی تھی لیکن ان کا اصل شاعرانہ جوہر اس وقت سامنے آیا جب وہ آگرے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہاں کالج اور شہر کے مشاعروں میں ان کے کلام کی پذیرائی ہونے لگی۔ ان کی شاعری میں رومانیت اور غنائیت کے امتزاج نے ایک حلقے کو اپنا اسیر کر رکھا تھا تاہم ان کو صحیح معنوں میں مقبولیت اور شہرت علی گڑھ میں ملی جہاں وہ کئی برس تک تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مقیم رہے، وہاں ترقی پسند تحریک کے اثر سے ان کے نغموں میں ایک نئی روح داخل ہوگئی 1938 میں ان کا شعری مجموعہ شائع ہوا۔ تو مزید ان کی پذیرائی کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ علی گڑھ کی سرزمین ان کے نغموں سے گونجنے لگی۔ یہاں کے مرد عورت سب ان کے کلام کے دیوانے رہتے تھے۔ خود مجاز سے ذاتی طور پر لوگوں کو بڑی محبت اور انس پیدا ہوگیا۔ ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا دائرہ روز بہ روز بڑھتا رہا اور پورے ملک میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ خصوصاً لکھنؤ میں ان کا حلقہ اثر بہت بڑھا ہوا تھا، مشاعروں میں لوگ مجاز کو سننے کے لیے شریک ہوا کرتے تھے۔

مجاز کا کلام گرچہ مقدار کے لحاظ سے بہت زیادہ نہیں ہے۔ تاہم غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظمیں نسبتاً زیادہ ہیں جن پر ان کی شہرت کا دار و مدار ہے۔ مجاز بنیادی طور پر تو رومانی شاعر ہیں اور ان کے موضوعات اس محور کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں یعنی جذبۂ عشق اور اس کی سرشاری اور وارفتگی۔ لیکن مجاز کے یہاں موضوعات میں تبدیلی اور تنوع بھی پیدا ہوا، خصوصاً جب ان کی فکر اشتراکی فلسفہ اور نظریات سے متعارف ہوئی۔ مجاز نے بتدریج ان تمام موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی جن میں انسانی مقدمات کی چیرہ دستی، نکت وخواری، غلامی، جہل اور تاریکی کے خلاف ان کا شدید ذہنی ردعمل شامل ہے۔ ان کا احتجاجی رویہ، تشویش اور تردد ان کے نغموں میں اس طرح ڈھل گیا کہ وہ ایک معتبر ترقی پسند شاعر قرار پائے۔

مجاز کی شاعری عہد شباب کے نوخیز جذبات، نازک خیلات اور اچھوتے شعری احساسات سے عبارت ہے۔ یہاں کلاسیکی روایات واقدار اور وفاداری تہہ نشین ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات واحساسات کی لطافت تو ہے۔ سطحیت اور عامیانہ پن نہیں۔ حزن و ملال، مایوسی اور شکست خوردگی بھی نہیں ۔ آہنگ کی غزلوں میں ایک خاص سرشاری، بانکپن اور وارفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ کلاسیکی روایات کے پاس و لحاظ کے باوجود مجاز کی غزلوں میں ان کی اپنی آواز سنائی دیتی ہے۔ مجاز کی نظموں میں جوش ملیح آبادی کے اثر سے بلند آہنگی۔ ہیجانی کیفیت، سکن گری

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اور رجائیت کا عنصر نمایاں ہے۔ نظم انقلاب میں تصور جذباتی ہے لیکن بعد کی نظموں میں مثلاً سرمایہ داری، بول: اری دھرتی بول! اور خواب سحر میں اشتراکی فکر کے سبب انقلاب کے ساتھ ایک منصفانہ معاشرے کی تشکیل کا تصور بھی پوشیدہ ہے تاہم یہ بات صحیح ہے کہ مجاز کی فنی مہارت اپنے اندر واضح ارتقائی نقوش نہیں رکھتی اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قدیم شعری سرمایہ سے گہرے لگاؤ اور نیم کلاسیکی طرز ادا سے پیدا ہونے والی دلچسپی نے انھیں شروع ہی میں خوبصورت فارسی ترکیبوں کے سہارے ڈھلے ڈھلائے رواں اور چست مصرعے لکھنے پر قدرت عطا کردی تھی جو آگے چل کر ان کے شاعرانہ معمول میں داخل ہوگیا۔

## تصانیف

مجاز کے صرف تین شعری مجموعوں کا ذکر ملتا ہے: 1.آہنگ 2.شب تاب 3.سازِ نو

## ادب میں مقام

مجاز ہر چند کہ اپنی تمام تر ترقی پسندانہ فکر اور اشتراکی رجحان کے باوجود کمیونسٹ پارٹی کے ممبر کبھی نہیں رہے، اس کے باوجود بھی ان کی شاعری میں انسانی بے بسی، محرومی اور دکھ کا جیسا شدید احساس و ادراک ہے، وہ کسی بھی ترقی پسند شاعر سے کم نہیں ہے۔ مجاز چونکہ تمام عمر ذاتی الجھنوں سے دوچار رہے۔ ان کی شاعری کا غالب رجحان رومانوی اور احساسی ہے جس پر فکر سے زیادہ جذبے کی حکمرانی ہے یہی وجہ ہے کہ غیر ترقی پسند حلقے میں ان کی پذیرائی زیادہ نہیں ہوسکی، تاہم ان کی جو بھی سماجی سیاسی، تہذیبی اور جمالیاتی ترجیحات رہی ہوں، ترقی پسند شاعری کے سرمایے میں انھوں نے اپنی سخنوری سے جو اضافے کیے ہیں۔ اس خدمت کے عوض ترقی پسند ادبی تاریخ میں ان کا مقام و مرتبہ یقیناً محفوظ ہے۔

## 14.3.3 نظم ''آوارہ'' کی تشریح

### آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

یہ رو پہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ ! لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

پھر ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں، رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لیے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پاسکتا ہوں پیمانہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے، یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

یادداشتیں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا، میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

## تشریح

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

مجاز ترقی پسند تحریک کے حامیوں میں تھے اور اس کا انھوں نے زور شور سے پرچار کیا تھا۔ ان کی شاعری

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

میں ترقی پسند تحریک کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ ان کی مذکورہ نظم ''آوارہ'' میں بھی اس کا نقش صاف طور پر نمایاں ہے۔ چنانچہ وہ اس بند میں شہر کی ایک رات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ناکامی اور نامرادی پر افسوس کناں ہیں۔ وہ شہر جہاں پر چہل پہل ہے، سڑکیں لائٹ سے روشن ہیں۔ ہر طرف خوشی کا ماحول ہے لیکن شاعر غیر کی بستی ہونے کی وجہ سے وہاں پر دربدری کی زندگی بسر کر رہا ہے اور اپنے مغموم اور خوفزدہ دل کو تسلی دے رہا ہے۔

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی زنجیر کی ایک کڑی سی پورے راستے میں بچھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے رات میں بھی دن کا گماں ہوتا ہے لیکن شاعر کے لیے یہ سب چیزیں اس کے سینے پر دہکی ہوئی شمشیر کی مانند ہیں جو اس کے سینے پر چبھ رہی ہیں۔ سوائے افسوس کے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے اور وہ اپنے مغموم اور خوفزدہ دل کو تسلی دے رہا ہے۔

یہ رو پہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفیوں کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ! لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

شاعر رات کا منظر پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آسمان پر تارے بکھرے ہوئے ہیں اور اس کے سایے چاندی کے مانند ہوگئے ہیں یہ منظر دیکھ کر صوفی کے تصور اور عاشق کے خیال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن ایسے موسم میں بھی جی کا حال جاننا اور سمجھنا مشکل ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے مغموم اور خوفزدہ دل کو تسلی دے رہا ہے۔

پھر ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

شاعر یہاں پر رات کا منظر پیش کرتے ہوئے ستارہ کے ٹوٹنے اور پھلجھڑی کے چھوٹنے کا ذکر کرتا ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہے کہ کس کی گود میں موتی کی لڑی آئی جس کی وجہ سے ہوک سی اٹھتی ہے اور دل میں تکلیف ہوتی ہے کہ یہ سب منظر ہوتے ہوئے بھی یہ اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اس بنا پر وہ اپنے مغموم اور خوفزدہ دل کو تسلی دے رہا ہے۔

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

رات جوان ہے اور میخانے میں ہر طرف چہل پہل ہے۔ نازنینوں کے محل کی طرف عاشق رواں دواں ہیں یہ سب چیزیں شاعر کو بھی اپنی طرف کھینچ رہی ہیں لیکن اس کے مقدر میں سوائے ویرانے کے کچھ بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے مغموم اور خوفزدہ دل کو تسلی دے رہا ہے۔

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں، رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

تا حد نظر جدھر دیکھو ادھر رنگینیاں اور رعنائیاں بکھری ہوئی ہیں اور ہر ہر قدم پر عیش و عشرت کی فراوانی ہے یہ سب ٹھیک ہے لیکن شاعر کی قسمت میں صرف رسوائی ہی رسوائی ہے اس لیے وہ اپنے مغموم اور مخدوش دل کو تسلی دے رہا ہے۔

راستے میں رک کے دل لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

شاعر یہاں پر اپنی عادت، اپنی فطرت، اپنی قسمت تینوں کا ذکر کر رہا ہے۔ اس کی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں ہے لیکن یہ اس کی عادت نہیں کہ وہ کچھ دیر کے لیے رک کر راستے میں آرام کرے۔ راستے سے واپس آنا بھی اس کی فطرت نہیں ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سفر میں کوئی اس کا ہمنوا اور ہم رکاب نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے مغموم اور خوفزدہ دل کو تسلی دے رہا ہے۔

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لیے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

شاعر کہہ رہا ہے کہ آفتوں اور بلاؤں کا طوفان میرا انتظار کر رہا ہے اور نہ جانے اس طرح کے کتنے دروازے اس کے لیے کھلے ہوئے ہیں جو اس کے منتظر ہیں لیکن اس کی فطرت میں جو سچائی اور وفا کو پورا کرنے کی جو روش ہے وہ اس کے لیے آج مصیبت بن گئی ہیں ورنہ وہ بلاؤں کے طوفان میں گم ہو گیا ہوتا اس بنا پر وہ اپنے مغموم اور خوفزدہ دل کو تسلی دے رہا ہے۔

جی میں آتا ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں پیمانہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے، یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

شاعر یہاں پر اپنے دل پر گزرنے والی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرا دل کہتا ہے میں عہد وفا بھی توڑ دوں اور محبوب تک میری رسائی ہوسکتی ہے یہ آسرا بھی چھوڑ دوں گویا شاعر ہوا و ہوس کی جس زنجیر میں جکڑا ہوا ہے اس کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتا ہے لیکن سوائے افسوس کے اور کچھ بھی نہیں ہوسکتا اس وجہ سے وہ اپنے مغموم اور خوفزدہ دل کو تسلی دے رہا ہے۔

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

یہ سب مناظر اور یہ حالت دیکھ کر شاعر کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا ہے لیکن وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے جس کی وجہ سے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور اس کے سینے میں جتنے بھی زخم تھے سب ہرے ہو گئے ہیں لیکن ان کا کوئی علاج نہیں ہے اور افسوس کرتے ہوئے وہ اپنے مغموم اور مخدوش دل کو تسلی دے رہا ہے۔

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

شاعر نے آگے رات کے مناظر بیان کیے تھے اب اس کا دل کہہ رہا ہے کہ سارے کے سارے چاند تارے نوچ لے کیوں کہ ایسے مناظر بھی اس کے مغموم دل کو تسلی نہ دے سکے۔

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

شاعر اپنی مفلسی اور سارے مناظر و مظاہر کا ذکر کرتا ہے اور یہ مظاہر جابر سلطانوں اور سیکڑوں چنگیز و نادر کی یاد دلاتے ہیں جس کی وجہ سے اسے رنج و غم ہوتا ہے لیکن سوائے افسوس کے وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا جس کی بنا پر اپنے مغموم اور مخدوش دل کو تسلی دے رہا ہے۔

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

شاعر کہہ رہا ہے کہ چنگیز جو ظلم و استبداد کی علامت ہے اسی طرح آج بھی چنگیز کا ظلم و ستم جاری ہے۔ اس لیے اس کا دل یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے ہاتھ میں جو خنجر ہے اسے توڑ دوں اور اس کے تاج پر جو دمکتا ہوا پتھر

یادداشتیں

ہے اسے بھی توڑنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے لیکن افسوس کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا جس کی وجہ سے وہ اپنے مغموم اور پریشان دل کو تسلی دے رہا ہے۔

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا، میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

یہ عیش وعشرت، یہ رنگینیاں، یہ مناظر ومظاہر جن پر اندر سبھا کا گمان ہوتا ہے شاعر کہتا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ عیش وعشرت کے سارے ساز وسامان توڑ دوں اور سارے گلشن اور سارے شبستانوں میں آگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے اور تخت سلطاں ہی نہیں بلکہ قصر سلطاں بھی پھونکنے کی خواہش رکھتا ہے لیکن افسوس کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا جس کی وجہ سے وہ اپنے مغموم اور پریشان ومخدوش دل کو تسلی دے رہا ہے۔

## 14.4 آپ نے کیا سیکھا

1. مجاز کی ابتدائی زندگی کے بارے میں آپ نے معلومات حاصل کی۔
2. مجاز کی تعلیم وتربیت، حالات زندگی سے واقف ہوئے۔
3. مجاز کے زمانے کے سیاسی، سماجی، ادبی ماحول سے متعارف ہوئے۔
4. مجاز کی شعری خصوصیات سے واقف ہوئے۔
5. مجاز کے ہمعصر شعرا کون تھے ان سے متعارف ہوئے۔

## 14.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. مجاز کی ترقی پسندی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. مجاز کی شاعری کے موضوعات کیا ہیں؟
3. مجاز کی شاعری کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟
4. مجاز کی شاعری آپ کو کیوں پسند ہے؟
5. ادبی تاریخ میں مجاز کا کیا مقام ہے؟

## 14.6 فرہنگ

| | | |
|---|---|---|
| ناشاد | = | نامراد |
| شہناز | = | خوبصورت |
| لالہ رخ | = | سرخ رخسار، گال |

| | | |
|---|---|---|
| رعنائیاں | = | رونقیں |
| عشرت | = | عیش، خوشی |
| ہمنوا | = | ساتھی |
| وا | = | کھلے ہوئے |
| عہد | = | وعدہ |
| عمامہ | = | پگڑی |
| شباب | = | جوانی |
| سلطان | = | بادشاہ |
| جابر | = | ظالم |
| شبستاں | = | شب گزارنے کی جگہ |

## 14.7 سوالوں کے جوابات

1. مجاز بے شک دل سے ترقی پسند تھے، وہ اس طبقے سے بہت قریب تھے اور ان اقدار کے سب سے بڑے ترجمان اور مفسر تھے جن کا تعلق ترقی پسند فکر و فلسفے سے تھا، حالانکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا باقاعدہ رکن یا کارڈ ہولڈر کبھی نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی جن موضوعات کو اپنی سخنوری کا موضوع بنایا وہ وہی تھے جن کا تعلق عوامی خوابوں، تمناؤں، معاشرتی زندگی کے عذاب و ثواب، دکھ درد، انسانیت کی تباہی و ہلاکت، ظلم و جبر، بے کسی اور تنہائی وغیرہ سے تھا۔ تاہم ان کا طریقہ دیگر ترقی پسندوں سے اس قدر مختلف تھا کہ مجاز، فیض کی مانند خیالات کا کھلم کھلا اشتہار نہیں پسند کرتے تھے، اپنی بات استعاروں کے پردے میں کہتے تھے، حالانکہ دونوں کے طرز ادا میں خاص فرق ہے۔

2. مجاز نے اپنی شاعرانہ ضرورتوں کے لیے جن حقائق کو اپنا موضوع بنایا وہ تمام تر اس عہد کی سماجی اور معاشرتی زندگی کے سلگتے ہوئے مسائل تھے۔ مجاز جس طرح کے زود حس اور ذمہ دار شاعر تھے وہ ایسے پر آشوب زمانے میں اپنی سماجی ذمہ داریوں سے پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے انھوں نے معاشرتی زندگی کے تضادات کو خصوصیت کے ساتھ اپنی فکر کا موضوع بنایا۔ غربت اور امارت کے مسئلہ کو انھوں نے اپنی نظموں میں بڑے دلفریب اور شاعرانہ طریقہ سے بیان کیا ہے۔ ایک بڑا طبقہ ان کا ہم خیال ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

3. مجاز کی شاعری عہد شباب کے نوخیز جذبات، نازک خیلالات اور اچھوتے شعری احساسات سے عبارت ہے۔ یہاں کلاسیکی روایات و اقدار سے وفاداری شرط اولین ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات و احساسات کی لطافت ہے۔ سطحیت اور عامیانہ پن نہیں۔ حسن و ملال ہے۔ مایوسی اور شکست خوردگی نہیں۔ کلاسیکی روایات اور ترقی پسندانہ مسلک پر چلتے ہوئے مجاز نے ایک اپنا ذاتی رنگ و آہنگ بھی ایجاد کیا تھا جوان

کی انفرادیت کا ضامن ہے۔ جوش نے اثر سے مجاز کی نظموں میں بلند آہنگی، ہیجانی کیفیت اور ایک دائمی خلش اور اضطراب ہے جو پڑھنے والے کے دل پر فوری اثر کرتا ہے اور عمل پر اکساتا ہے۔ مجاز بنیادی طور پر ایک رومانی طرز احساس کے شاعر ہیں جنھیں زندگی کی حشر سامانیوں سے دلچسپی ضرور ہے لیکن ان کے جسم و جان کی اپنی ضرورتیں بھی ہیں، ان کی تشنہ کام زندگی اور روح کے مطالبات مرتے دم تک نہ پورے ہوسکے۔ جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

4. مجاز کی شاعری اپنے اندر ایک تاثیر اور قوتِ شفا رکھتی ہے۔ اس کی رومانی اور Sensetive کیفیت نوجوان دلوں پر برقی رو کی طرح اثر کرتی ہے۔ یہ ایک غمزدہ، محروم اور مظلوم انسان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے جس کا سوز قاری کے دل کو مسوس کر رکھ دیتا ہے۔ تڑپا دیتا ہے۔ ایک عجیب سا رشتہ ہے جو ہر پڑھنے والا اس شاعری میں پلنے والے گہرے خیالات سے محسوس کرتا ہے۔ اس رشتے کی وضاحت مشکل ہے لیکن اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے۔

5. مجاز کی فکر کا غالب رجحان رومانی ہے۔ اس کے باوجود بھی ترقی پسند خیالات ان کی شاعری کے رگ و ریشے میں اس طرح پیوست ہوگئے ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ہر چند ترقی پسندوں نے ان کی پذیرائی کی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے لیکن جدیدیت کے حلقہ بگوشوں میں مجاز باریاب نہ ہوسکے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے سماجی سروکار میں بے پناہ خلوص، ریاضت اور سچی لگن کے سبب ترقی پسند ادب کی تاریخ میں روشنی کا مینار بن کر اجالا کرتے رہیں گے۔

## 14.8 کتب برائے مطالعہ


| | | |
|---|---|---|
| 1۔ | آہنگ | مجاز |
| 2۔ | شب تاب | مجاز |
| 3۔ | سازِ نو | مجاز |
| 4۔ | اسرار الحق مجاز شخصیت اور شاعری | مرتبہ اظہر نبی |
| 5۔ | مجاز-حیات اور شاعری | منظر سلیم |
| 6۔ | علی گڑھ میگزین | مجاز نمبر |

# اکائی نمبر 15 علی سردار جعفری کی شاعری اور منتخب کلام کا تجزیہ

**ساخت**


15.1 اغراض و مقاصد

15.2 تمہید

15.3 علی سردار جعفری کی شاعری

15.3.1 علی سردار جعفری کا تعارف

15.3.2 علی سردار جعفری کی شعری خصوصیات

15.3.3 نظم ''میرا سفر'' کی تشریح

15.4 آپ نے کیا سیکھا

15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

15.6 فرہنگ

15.7 سوالوں کے جواب

15.8 کتب برائے مطالعہ


## 15.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

- علی سردار جعفری کے حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- علی سردار جعفری کے کلام کی خصوصیات کو سمجھ سکیں گے۔
- علی سردار جعفری کے ہم عصر شعرا کے بارے میں جان سکیں گے۔
- علی سردار جعفری کی نظموں کے موضوعات سے واقف ہوں گے۔
- علی سردار جعفری کی نظم ''میرا سفر'' کا خلاصہ بیان کرسکیں گے۔

## 15.2 تمہید

ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں علی سردار جعفری کا نام سب سے نمایاں ہے۔ وہ بلند پایہ شاعر بھی تھے اور ناقد، دانشور، خطیب، مدون و مترجم، صحافی، ہدایت کار اور نغمہ نگار بھی تھے۔ لیکن انھیں سب سے زیادہ مقبولیت نظم گو شاعر کی

حیثیت سے ملی۔ سامراجی اور استحصالی قوتوں کے خلاف بغاوت، حریت اور آزادی کے لیے جدوجہد، دبے کچلے انسانوں، عورتوں، مزدوروں، کسانوں اور کمزور ومظلوم طبقات کے لیے ہمدردی کا جذبہ ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔

## 15.3 علی سردار جعفری کی شاعری

### 15.3.1 علی سردار جعفری کا تعارف

علی سردار جعفری کی پیدائش 29 نومبر 1913 کو بلرام پور (اتر پردیش) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم آبائی وطن میں حاصل کی۔ 1932 میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ 1933 میں انگریزوں کے خلاف ایک جوشیلی تقریر کرنے کے الزام میں انھیں گرفتار کیا گیا لیکن خاندانی اثر و رسوخ کی بنا پر جلد ہی رہا کر دیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کی ملاقات اسرار الحق مجاز، خواجہ احمد عباس، معین احسن جذبی، سبط حسن، اختر حسین رائے پوری وغیرہ سے ہوئی۔ ان لوگوں کی قربت اور اپنی باغیانہ طبیعت کی وجہ سے علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ اور اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ علی سردار جعفری نے بی.اے کی بقیہ تعلیم اینگلو عربک کالج، دہلی سے مکمل کی۔ اس کے بعد وہ لکھنؤ چلے آئے اور ایم.اے میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کی شاعری پروان چڑھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن کے طور پر انھوں نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعے سامراجیت اور انگریزوں کے ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کی۔ انھیں اس کی وجہ سے ایم.اے فائنل کے امتحان میں شریک نہیں ہونے دیا گیا اور گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

علی سردار جعفری کو اُردو، فارسی اور انگریزی پر قدرت حاصل تھی۔ 1942 میں لکھنؤ سے 'نیا ادب' کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ 1967 میں بمبئی سے سہ ماہی رسالہ 'گفتگو' شائع کیا۔ یکم اگست 2000 کو ممبئی میں انتقال ہوا۔

### 15.3.2 علی سردار جعفری کی شعری خصوصیات

علی سردار جعفری ترقی پسند شعرا کے صف اوّل کے شاعر تھے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک پر تنقیدی کتاب 'ترقی پسند ادب' کے نام سے لکھی۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانوں کے ایک مجموعے 'منزل' سے کیا جو 1938 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 'نئی دنیا کو سلام'، 'خون کی لکیر'، 'ایشیا جاگ اٹھا'، 'پتھر کی دیوار'، 'ایک خواب اور'، 'پیراہن شرر'، 'لہو پکارتا ہے' اور 'امن کا ستارہ' شعری مجموعے شائع ہوئے۔ کبیر، میر اور غالب سے انھیں بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے تینوں کا کلام اُردو اور دیوناگری رسم خط میں اپنے تعارفی مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں پدم شری، سوویت، لینڈ نہرو ایوارڈ، سجاد ظہیر ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ، اقبال سمان، گیان پیٹھ ایوارڈ وغیرہ سے نوازا گیا۔

یادداشتیں

## 15.3.3 نظم ''میرا سفر'' کی تشریح

### میرا سفر

پھر ایک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اُڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
پھولوں کی طرح ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھوجائیں گی
خود کی گردش دل کی دھڑکن
سب راگنیاں سوجائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یہ میری جنت یہ میری زمیں
اس کی صبحیں اس کی شامیں
بے جانے ہوئے بے سمجھے ہوئے
ایک مشت غبار انساں پر
شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے حسیں بت خانے سے
ہر چیز اُٹھادی جائے گی
پھر کوئی نہیں پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے ذہن سے بولوں گا

یادداشتیں

چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹّی کی تہوں کو چھوڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگ حِنا آہنگ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا
رخسارِ عروسِ نو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا
جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصل خزاں کولائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے مرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھرجائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا فسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایّام کے افسوس خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سوجاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے اَمر ہوجاتا ہوں

## تشریح

شاعر نے اس نظم میں زندگی کے مسلسل رواں ہونے کے بنیادی فلسفے کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی ایک مستقل جاری رہنے والا سلسلہ ہے جو ہمیشہ سے جاری تھا اور یوں ہی جاری رہے گا۔ شاعر کہتا ہے کہ آدمی کا جسم مٹ جاتا ہے، چیزوں کی صورتیں تبدیل ہوجاتی ہیں اور مناظر بھی اپنی شکل بدل لیتے ہیں، مگر زندگی نہیں ختم ہوتی ہے یعنی انسان نہیں مرتا ہے۔ زندگی کا مسلسل جاری رہنے والا عمل کسی نہ کسی رُوپ میں قائم رہتا ہے۔ شاعر آگے کہتا ہے کہ میں یعنی شاعر کی ذات بھی ایک دن ختم ہوجائے گی لیکن اس کا فن یوں ہی باقی رہے گا یعنی زندگی بارقی رہے گی اور وہ الگ الگ شکلوں میں ظاہر ہوتی رہے گی۔ شاعر نے اس نظم میں مختلف پیرایوں سے یہ ظاہر کرنے کی سعی کی ہے کہ جو کچھ مجھ میں دکھائی دے رہا ہے وہ سب ایک دن ختم ہوجائے گا۔ شاعر نے بڑی خوبصورتی سے فطرت کے مختلف مظاہر میں خود کو سمویا ہے کیونکہ آدمی بھی تو حیاتیاتی طور پر فطرت کا ایک مظہر ہی ہے۔ اور صرف مظاہر فطرت ہی نہیں شاعر نے خود زندگی کی دیگر خوبصورت نشانیوں میں خود کو ظاہر کیا ہے۔ نظم کو پڑھنے کے بعد ایک خاص طرح کی رجائیت کا احساس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ موت اپنے آپ میں کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بھی زندگی کا ایک تسلسل ہی ہے اس لیے زندگی بامقصد اور حسین لگنے لگتی ہے۔ نظم ''میرا سفر'' پیکر تراشی کے فن کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ اس نظم میں ایسے ٹھوس اور مرکب پیکر ہیں جو قاری کو تخیل کے سہارے کسی اور جہاں کی سیر کراتے ہیں جس سے قاری کے حواس مکمل طور پر متاثر ہیں۔

## 15.4 آپ نے کیا سیکھا

1. علی سردار جعفری کا سوانحی خاکہ اور ان کی سماجی زندگی کا پتا چلتا ہے۔
2. علی سردار جعفری کی شاعری کے موضوعات کا اندازہ ہوتا ہے۔
3. علی سردار جعفری کے اسلوب کی خصوصیات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔
4. علی سردار جعفری کی نظم 'میرا سفر' کی تشریح سامنے آتی ہے۔

## 15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. علی سردار جعفری کی شاعری کی اہم خصوصیات بیان کیجیے؟

یادداشتیں

2. عنوان ''میرا سفر'' سے اس نظم میں کیا معنی مراد لیے گئے ہیں؟
3. 'گریزاں لمحے'، 'افسوں خانے'، 'مشتِ غبار' کے معنی بیان کیجیے؟
4. علی سردار جعفری کے پانچ شعری مجموعے کے نام بتائیے؟

## 15.6 فرہنگ

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| برگ | = | پتا، ورق | نطق وصدا | = | بولنا اور آواز دینا |
| مشت غبار | = | مٹھی بھر مٹّی | سرسبز | = | ہرا بھرا، شاداب |
| رنگ حنا | = | مہندی کا رنگ | آہنگ غزل | = | غزل کی آواز |
| عروسِ نو | = | نئی نویلی دُلہن | افسوں خانے | = | فریب خانے، جادوگھر |
| گریزاں لمحہ | = | تیزی سے گزرتا ہوا لمحہ | | | |

## 15.7 سوالوں کے جواب

1. علی سردار جعفری ترقی پسند شعرا کے صفِ اوّل کے شاعر تھے۔ انھوں ترقی پسند تحریک پر تنقیدی کتاب 'ترقی پسند ادب' کے نام سے لکھی۔ 'نئی دنیا کو سلام'، 'خونی لکیر'، 'ایشیا جاگ اُٹھا'، 'پتھر کی دیوار'، 'ایک خواب اور'، 'پیراہنِ شرر'، 'لہو پکارتا ہے'، 'امن پکارتا ہے' اور 'امن کا ستارہ' شعری مجموعہ شائع ہوا۔ ان کی شاعری پر سامراجیت اور انگریزوں کے ظلم وتشدد کے خلاف آواز سنائی دیتی ہے۔ ذہن میں آگ تھی اور سینے میں لاوا کھول رہا تھا۔ پورے ادبی ماحول میں نئی نسل کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں علی سردار کی شخصیت اور شاعری ایک باغی اور انقلابی کی تصویر جھانک رہی تھی۔ علی سردار جعفری سب کے ہیرو بنے ہوئے تھے۔
2. شاعر نے اس نظم میں زندگی کے مسلسل رواں ہونے کے بنیادی فلسفے کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی ایک مستقل جاری رہنے والا سلسلہ ہے جو ہمیشہ سے جاری تھا اور یوں ہی جاری رہے گا۔
3. تیزی سے گزرتا ہوا لمحہ، فریب خانے (جادوگھر) ، مٹھی بھر مٹی۔
4. 'ایشیا جاگ اُٹھا'، 'پتھر کی دیوار'، 'ایک خواب اور'، 'لہو پکارتا ہے'، 'امن کا ستارہ'۔

## 15.8 کتب برائے مطالعہ

1. علی سردار جعفری: شخصیت اور فن — سیّد عقیل احمد، انجمن ترقی پسند مصنّفین، الہ آباد
2. علی سردار جعفری: حیات اور تخلیقی جہات — علی احمد فاطمی، پبلیکیشنز ڈویژن، دہلی
3. علی سردار جعفری: قمر رئیس — ساہتیہ اکادمی، دہلی

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

IGNOU/MPDD/P.O. 7.1K/July, 2019

ISBN : 978-93-88980-89-0